جلد ۸۵ اپریل ۱۹۷۶ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۵	اپریل ۱۹۷۶ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ	عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ —— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مغربی تہذیب کے بطن سے جو مہلک عوارض نمودار ہوئے ہیں ان میں جھوٹے پروپیگنڈے کا عارضہ اخلاقی اعتبار سے بڑا تباہ کن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مکروفریب، دروغ گوئی، نفاق، عیاری اور ریاکاری جیسی اخلاقی بیماریاں انسانیت کو شروع ہی سے نقصانات پہنچاتی چلی آئی ہیں مگر دورِ جدید کا کمال یہ ہے کہ اس میں ان امراض نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی ہے اور جو شخص ان میں گرفتار ہوتا ہے وہ ندامت محسوس کرنے کے بجائے اپنی اس فنی مہارت پر اتراتا اور فخر کرتا ہے اور جو لوگ ان اخلاقی عوارض سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں مریض سمجھ کر ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آج اگر کوئی فرد یا گروہ اپنے ضمیر کی آواز پر کسی قول یا فعل یا موقف کی تائید یا مخالفت میں یا کسی اصول کی بنا پر صعوبتیں برداشت کرتا ہے، یا بعض دنیوی فوائد سے محروم ہونا گوارا کرتا ہے تو لوگ اسے دیوانہ خیال کرتے ہیں درآنحالیکہ وہی درحقیقت فرزانہ ہے اور جو لوگ چند روزہ زندگی اور اس کے لذائذ کی خاطر اپنے ضمیر اور ایمان کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں وہ پاگل اور دیوانے ہیں کیونکہ دیوانہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے اپنے سود و زیاں کا احساس نہ ہو اور اس سے بڑا دیوانہ اور کون ہو سکتا ہے جو دنیا کے چند روزہ فوائد کی خاطر اپنی آخرت کو تباہ کرنے پر تیار ہو جائے۔

بُرا ہو جھوٹے پراپیگنڈے کے خوفناک مرض کا کہ اس نے نہ صرف لوگوں کے اخلاقی احساسات کو برباد کیا ہے بلکہ انہیں فریبِ نفس جیسے مہلک مرض میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے جس سے اُن کے شفایاب ہونے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ ایک انسان اپنی صحت کی بحالی کے لیے اس وقت فکرمند ہوتا ہے جب اُسے یہ احساس ہو کہ اُسے کوئی عارضہ لاحق ہے۔ لیکن جب کسی انسان کو کوئی ایسا روگ لگ جائے جو اُس کے شعور و احساس

کو اس طرح بدل دے کہ علالت اسے تندرستی اور صحت اسے بیماری نظر آنے لگے تو پھر وہ مریض کس طرح صحت مند ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مغرب کے جھوٹے پراپیگنڈے کی قوت نے لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ حق و صداقت انہیں عیوب اور مکر و فریب انہیں ہنر دکھائی دیتے ہیں۔ جو چیز فی الحقیقت محمود ہے وہ انہیں مذموم نظر آتی ہے اور جو افعال مذموم ہیں انہیں وہ محمود سمجھتے ہیں۔ افکار و نظریات کے اس ہمہ گیر تغیر سے دنیا کا پورا نظام اخلاق درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس اخلاقی انتشار کے اندر کوئی روحانی قدر اپنی اصلی جگہ پر قائم نہیں رہی۔ باطل افکار کا طوفان ساری اخلاقی اقدار کو اپنے ساتھ بہاتا چلا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دورِ حاضر کا انسانی معاشرہ اخلاقی اعتبار سے کسی خوفناک ویرانہ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

مکر و فریب کی اس عملداری کے سینکڑوں بھیانک مناظر زندگی کے ہر شعبے میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں جن سے انسان کے اندر یہ اندوہناک احساس پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں غالباً نیکی، شرافت، خدا پرستی اور صداقت شعاری کے سارے چشمے سوکھ چکے ہیں اور نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت اس صفحۂ ہستی پر صرف اس لیے موجود ہے کہ انسانیت کے عیار شکاری اس پر جس طرح چاہیں مشقِ ناز کرتے رہیں۔ آپ دنیا کے سیاستدانوں اور ان کے دلفریب نعروں اور پھر ان نعروں کے پس پردہ ہونے والے ہولناک مظالم پر غور کریں تو انسانیت کی مظلومیت دیکھ کر آپ کا کلیجہ شق ہونے لگے گا۔ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں اس وقت دنیا کی زمامِ کار ہے ان کی زبانوں پر یوں تو ہر وقت امن اور سلامتی کا پیغام جاری رہتا ہے۔ وہ بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ بقائے باہمی کے اصول کا پرچار کرتے ہیں اور مظلوم اور ستم زدہ انسانیت کی فلاح کے لیے بڑے جاذبِ نظر منصوبے سامنے لاتے ہیں لیکن دنیائے عمل میں دکھی انسانیت کے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا جاتا ہے وہ خوش کن نعروں، دعووں اور منصوبوں کی عین ضد ہوتا ہے۔ امن اور آشتی کے فدائی اور بقائے باہمی کے علمبردار ہمیشہ اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ یہ دھرتی ہر لمحہ آگ کی لپیٹ میں رہے اور انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر اس درندگی کا مظاہرہ کریں کہ جسے دیکھ کر درندوں کی آنکھیں بھی شرم کے مارے جھک جائیں۔ کمزور قوموں کی آزادی سلب ہو، ان کے ذرائع کا بے محابا استحصال کیا جائے، ان کی نوخیز نسلیں فکری اعتبار سے مفلوج اور اخلاقی لحاظ سے تباہ ہوں اور ان کی وحدت اس انداز سے پارہ پارہ ہو کر رہ جائے کہ قیامت تک پھر ان اقوام کی شیرازہ بندی ممکن نہ ہو۔ آپ دنیا کی طاقتور قوموں کے سربراہوں اور ان کے مشیروں کی کارگزاریوں کا جائزہ لیں تو آپ پر ان لوگوں کی انسانیت دشمنی

کی حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔ امریکہ اور رُوس جس قسم کی شاطرانہ چالیں چل کر کمزور قوموں کو ایک دوسرے سے ٹکرانے اور پھر اس ٹکراؤ کے بعد ثالث کی حیثیت سے ان کے درمیان عداوت کے جو مستقل بیج بوتے ہیں اس سے کون ناواقف ہے۔ ان بڑی طاقتوں کی عیاریوں اور زبردست آزاریوں کی وجہ سے یہ دُنیا جہنم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اگر یہ طاقتیں اپنے دعووں میں کچھ بھی مخلص ہوتیں اور انہیں اپنے اقوال کا کچھ بھی پاس ہوتا تو انسانیت اس عذاب سے محفوظ رہتی جس میں کہ وہ اپنے آپ کو گرفتار پاتی ہے۔ عرب ممالک کے عین دل میں صہیونی ریاست کا خنجر جس سفاکی کے ساتھ اور عدل و انصاف کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کر کے پیوست کیا گیا ہے وہ ان بالا دست قوموں کے مجرم ضمیر کی شہادت فراہم کرتا ہے پھر اس خنجر کو یہ قومیں جس درندگی کے ساتھ دنیائے اسلام کے جسد میں گھاؤ کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ سرخ و سفید سامراج دونوں مل کر پاکستان اور دوسری مسلم ریاستوں کے اسلامی رنگ کو بگاڑنے اور انہیں معاشی اور سیاسی اعتبار سے برباد کرنے کے لیے جو شاطرانہ چالیں چل رہے ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان دونوں سامراجی قوتوں میں بظاہر کھچاؤ نظر آتا ہے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شدید کشمکش کی صورت بھی اختیار کرتا رہتا ہے لیکن اپنے سارے اختلافات کے باوجود یہ قوتیں مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو توڑنے میں ایک دوسرے سے بالکل متفق و متحد ہیں۔ اگر امریکہ بہادر کی تائید اور حمایت سے اسرائیل عرب ممالک پر حملہ کرتا ہے تو روس خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتا ہے اور چند بیانات جاری کرنے کے علاوہ اور کوئی قدم نہیں اٹھاتا بلکہ جنگ کے خاتمے پر اُسے جب اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اسرائیل افرادی قوت کے اعتبار سے عربوں کے مقابلے میں کمزور رہے تو وہ اپنے ملک کی آبادی کو اسرائیل کی طرف منتقل کرتا ہے تاکہ اس کی اس کمزوری کو دُور کیا جا سکے۔

دُنیا کے ان "وڈیروں" کے ہاتھوں پاکستان کو جو شدید نقصانات اٹھانے پڑے ہیں اُن کی داستان بڑی دلفگار ہے۔ جس وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے مذہب کی اساس پر ایک خطۂ ارض کا مطالبہ کیا تو اسے کسی دیوانے کا خواب سمجھ کر پہلے تو ہدفِ تضحیک بنایا گیا۔ مگر جب اس مطالبہ نے زور پکڑا اور انگریز اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوا تو پھر اس امر کی کوششیں کی گئیں کہ یہ ملک جس پاکیزہ مقصد کی تکمیل کے لیے قائم ہوا وہ کسی طور پورا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس کے لیے پہلے تو یہ التزام کیا گیا کہ اس ملک کو افراتفری

کے عالم میں چھوڑا جائے تاکہ یہ قوم اس امر کا فیصلہ نہ کر پائے کہ اسے نئی اسلامی مملکت کی عنانِ اقتدار کن لوگوں کو سونپنی ہے اور اسے کس سمت میں آگے بڑھنا ہے۔ جن لوگوں نے تقسیمِ ملک کا رُوح فرسا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت حالات کس قدر پُرآشوب تھے۔ جگہ جگہ معصوم اور بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔ انسان نما درندے عورتوں کی عصمتیں لوٹ رہے تھے اور لاکھوں افراد بڑی کس مپرسی کی حالت میں اپنے گھر اور کاروبار چھوڑ کر پاکستان کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ شدید اضطراب کی اس اندوہناک فضا میں عوام اس بات کے آرزومند تھے کہ کسی طرح انہیں سکون میسّر ہو۔ اس موقعے کو غنیمت جان کر مغربی تہذیب و تمدّن اور مغربی اقدارِ حیات کے دلدادہ طبقے نے جو اس ملک کی انتظامیہ پر بھی قابض تھا، اپنی گرفت مضبوط کر لی اور ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے جس فرد اور گروہ کو چاہا تختِ اقتدار پر براجمان کیا اور جس کو چاہا اس سے محروم کر دیا۔ یہ "بادشاہ گر طبقہ" جس کی عظیم اکثریت کو اس ملک کے فرنگی آقاؤں نے اپنے رنگ میں پوری طرح رنگ رکھا تھا، پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے میں سخت مزاحم ہوا۔ دوسری طرف مسلم عوام کے لیے یہ بات کسی طرح گوارا نہ تھی کہ جس دین کی عملداری کے لیے یہ ملک قائم ہوا ہے اور جس کے قیام کی خاطر انہوں نے بے پناہ قربانیاں دی ہیں وہ الحاد کی آغوش میں چلا جائے۔ چنانچہ اس ملک کے اندر عوام اور حکمرانوں کے مابین بالکل آغاز ہی میں آویزش شروع ہو گئی۔ نصب العین کے معاملے میں مختلف طبقات کے درمیان اختلافات ہونے کی وجہ سے نہ تو یہاں کے افراد کی صلاحیتیں بروئے کار آسکیں اور نہ اس ملک کے وسائلِ تعمیر و ترقی کی راہ پر لگائے جا سکے بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس ملک اور اس کے باشندگان کو ودیعت کیا تھا وہ باہمی سر پھٹول میں ضائع ہو گیا۔

دورِ حاضر کی بڑی طاقتوں نے اس ملک کے اندر داخلی انتشار پیدا کرنے کے علاوہ اس کے لیے ایسے مستقل خارجی خطرات بھی کھڑے کر دیے جو اس کے لیے ہر قدم پر مصائب پیدا کر رہے تھے۔ ریاستوں کے بارے میں جو اُصول طے کیا گیا تھا اسے بھارت نے سامراج قوتوں کی شہ پا کر یکسر نظر انداز کر دیا اور کسی اخلاقی اور قانونی جواز کے بغیر جونا گڑھ، حیدر آباد اور کشمیر پر قبضہ جما لیا۔ امریکہ آغاز میں کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کی کسی قدر تائید کرتا رہا لیکن روس چونکہ بھارت کا پُرجوش مؤید تھا اور خود امریکہ اپنے مفادات کی خاطر اسے ناراض کرنے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا اس لیے یہ مسئلہ حل ہونے کے بجائے مسلسل اُلجھتا چلا گیا اور ان دونوں

ممالک کے مابین مستقل وجہ نزاع بن گیا جس نے بعد میں شدید عداوت اور دشمنی کی صورت اختیار کرلی۔ اگر امریکہ اور روس دونوں اخلاص کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنے کے خواہاں ہوتے تو یہ بطریقِ احسن حل ہوجاتا اور اس برصغیر میں پائیدار امن کے قیام کی کوئی صورت نکل آتی لیکن ان دونوں سامراجی قوتوں کی ریشہ دوانیوں سے نہ صرف پاکستان اور بھارت بلکہ افغانستان اور اسی منطقہ سے تعلق رکھنے والے دیگر ممالک کا امن غارت ہوکر رہ گیا ہے۔ ان ممالک کی آزادی ہر وقت معرضِ خطر میں پڑی رہتی ہے اور ان کی سالمیت کے خلاف ہر آن سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان سازشوں کے نتیجے ہی میں پاکستان کا ایک بازو ٹوٹ کر الگ ہوگیا ہے۔ بھارت نے روس کی معاونت سے مشرقی پاکستان میں ننگی جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر قبضہ کرلیا اور امریکہ اور دوسری بڑی طاقتیں یہ خونی ڈرامہ بڑے اطمینان کے ساتھ دیکھتی رہیں اور ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ اقوام متحدہ کی تنظیم جس کا مقصدِ وجود ہی کمزور قوموں کی آزادی کا تحفظ اور دنیا میں جارحیت کا خاتمہ ہے وہ بھی اس موقعے پر اپنے بنیادی فرض سے یکسر غافل رہی اور اس طرح ایک بے بس اور مظلوم قوم کی آزادی سلب ہوگئی اور جب یہ سب کچھ ہوچکا تو پھر پاکستان کے زخموں پر نمک پاشی کی غرض سے امریکہ کی طرف سے ہمیں یہ پیغام موصول ہوا کہ پاکستان کی سالمیت کا تحفظ اس کی خارجہ پالیسی میں کونے کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں جن کی کُل آبادی چند لاکھ نفوس سے بھی زیادہ نہیں ہے اگر اپنے آپ کو ہر طرح محفوظ و مامون پاتی ہیں تو مشرقی ممالک کی سالمیت کو آخر ہر وقت کیوں خطرہ درپیش رہتا ہے اور ان ممالک میں سیاسی اور معاشی استحکام کیوں پیدا نہیں ہونے پاتا۔ اس کی وجہ بڑی طاقتوں کا انسانیت سوز طرزِ عمل اور ان کی منافقانہ روش ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپ کی سامراجی طاقتیں اس قدر نحیف اور لاغر ہوگئیں کہ ان کے لیے اپنی نوآبادیوں پر بالجبر قابض رہنا ممکن نہ رہا لیکن انہوں نے حالات کے تقاضوں کے تحت ان ممالک کو آزاد تو کردیا مگر اس بات کا پوری طرح اہتمام کیا کہ یہ ممالک آزادی حاصل کرلینے کے بعد اپنے آزادی کے ثمرات سے متمتع نہ ہوسکیں بلکہ وہاں کے عوام کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ انہوں نے آزادی کی جنگ جیت کر سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ غیر ملکی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اُن کی زندگیاں تلخ تر ہوگئی ہیں۔ وہ جب غیر ملکی طاقتوں کے تسلّط میں تھے تو انہیں کسی قدر جان و مال کا تحفظ حاصل تھا۔ انتظامیہ کا مزاج اگرچہ جابرانہ تھا مگر وہ اتنی بے حس، ظالم اور سفاک نہ تھی جتنی کہ اب ہے

اور اسی بنا پر سماج دشمن عناصر کھل کھیلنے میں اتنے جری نہ تھے جتنے کہ اب نظر آتے ہیں۔ عوام کے اندر یہ احساس محرومی بلکہ احساسِ ناکامی کسی قوم کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب لوگوں کے دلوں میں آزادی کی کوئی قدر باقی نہ رہے بلکہ وہ دورِ غلامی کو دورِ آزادی پر ترجیح دینے لگیں اور ان کے اندر یہ احساس پرورش پانے لگے کہ انہوں نے آزادی حاصل کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور ان گنت مصائب کو دعوت دی ہے تو ان منفی احساسات کے ساتھ وہ آزادی کا کس طرح تحفظ کر سکتے ہیں۔ ان منفی احساسات کا وجود بطورِ خود کسی قوم کے لیے سخت خطرے کی علامت ہوتا ہے لیکن اگر اس کے رہنما اس خطرے کا صحیح احساس کر کے یاس و قنوطیت کے جذبات کو امید و رجا سے بدلنے کے بجائے مکر و فریب سے کام لینا شروع کر دیں تو اس قوم کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟ کسی قوم کے اندر عدمِ تحفظ کا احساس یونہی تو پیدا نہیں ہو جاتا۔ برسہا برس کی محرومیوں اور ناکامیوں کے بعد قوموں کو یہ روگ لگتا ہے اور جب یہ روگ لگ جائے تو بڑی مؤثر تدابیر اختیار کرنے کے بعد ہی کسی قوم کو اس سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی قوم کے حقیقی خیر خواہ ہوتے ہیں وہ اس مرض کے تدارک کے لیے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قوم کی اخلاقی کمزوریوں اور اس کے نفسیاتی عوارض سے نہ تو خود کوئی فائدہ اٹھایا جائے اور نہ کسی دوسرے کو اس نقب زنی کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں۔ اس کے علاوہ جس قوم کو خوابوں کے سہارے جینے، آرزوؤں کے پیچھے چلنے اور کھوکھلے نعروں پر لبیک کہنے اور نمائشی کاموں پر فریفتہ ہونے کی عادت پڑ گئی ہو اسے حقائق سے دوچار کرنے کی باقاعدہ تربیت دی جائے تاکہ وہ خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر ٹھوس واقعات کی دنیا میں سرگرم عمل ہو سکے۔ قوم کے سچے بہی خواہوں کو عوام کی گردنوں پر مسلط ہونے، ان کی پریشان فکری اور پریشان نظری اور جذباتیت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس بات کی فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ کس طرح قوم کے اندازِ فکر میں حق پرستی، جذبات میں اعتدال اور افعال و اعمال میں حقیقت پسندی کے جوہر پیدا ہوں کیونکہ ان کو پیدا کیے بغیر نہ تو کسی قوم کی اخلاقی صحت درست ہو سکتی ہے اور نہ وہ قوم طالع آزماؤں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

فلسفۂ مذہب کے ایک نامور عالم نے مذہبی جذبات کی عظمت پر بحث کرتے ہوئے یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہی ہے کہ یہ جذبات انسانی زندگی کے لیے جس قدر بیش قیمت اور مقدس ہوتے ہیں اسی نسبت سے دنیا کے عیار لوگ ان سے زیادہ سے زیادہ ناجائز فوائد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور جو لوگ

یہ مذموم کاروبار کرتے ہیں اُن سے زیادہ ذلیل دنیا میں اور کوئی مخلوق نہیں ہوتی کہ وہ چند دُنیوی فوائد کی خاطر انسان کی سب سے مقدس متاع سے کھیلنے میں بھی کوئی تردّد محسوس نہیں کرتے۔ اِسی طرح دھوکہ دہی بذاتِ خود ایک نہایت معیوب فعل ہے اور اسے اخلاق کی دنیا میں کسی جگہ بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اس فرد یا گروہ کی اخلاقی پستی کا اندازہ کریں جو اپنے بھائی بندوں اور اپنی قوم کے افراد کے مذہبی جذبات سے کھیل کر اپنے لیے عزّت و احترام کا کوئی بلند مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا اس آسمان کے نیچے اس شخص یا گروہ سے زیادہ کوئی ظالم، سفاک اور اپنی قوم کا بداندیش اور انسانیت کا دشمن کوئی دوسرا فرد یا گروہ ہو سکتا ہے؟ جن لوگوں نے مذہب اور اس کے متعلقات خصوصاً مذہبی جذبات و احساسات اور اُن کی نوعیت کا دِقّتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اس سُنّت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جس قدر کسی مقدس چیز سے ناجائز فائدہ اُٹھانا سہل اور آسان ہے اُسی نسبت سے یہ ناجائز انتفاع مہلک بھی ثابت ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کی غیرت آخر یہ کس طرح گوارا کر سکتی ہے کہ اس کے پاکیزہ نام پر لوگوں کو دھوکا دیا جائے۔ چنانچہ جو افراد مذہب کے نام پر عوام کو فریب دیتے ہیں مالک المُلک جلد ہی اُن کے اصل عزائم سے پردہ اُٹھا کر انہیں دُنیا میں ذلیل و خوار کرتا ہے۔ اگر کوئی دُنیوی حکمران یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی مملکت کے اندر اس کے نام پر کھوٹے سکّوں کا چلن ہو تو اس کائنات کا فرمانروائے حقیقی اس اندوہناک صورتِ حال کو کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ اُس کی مخلوق کو اس کے مقدس نام پر دھوکہ دیا جائے۔ چنانچہ جو لوگ دُنیاوی فائدوں کی خاطر اس طرح کی عیاریوں سے کام لے کر عوام کو بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے اصل مقاصد کو آشکارا کر دیتا ہے تاکہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں اور حقیقتِ حال سامنے آ جانے کے بعد اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر سکیں۔

مذہبی معاملات میں عیاری کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ مذہب کے نام پر فریب کھانے کے بعد جب لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور انہیں اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ کسی مقدس شے کے نام پر ان سے ایک شرمناک کھیل کھیلا گیا ہے تو اُن کے دل پر اس قدر شدید چوٹ پڑتی ہے کہ وہ اس کی تاب نہیں لا سکتے۔ ان کا ذہن اپنی کوتاہ نظری، عاقبت نااندیشی، عدم تدبّر اور جذباتیت کی طرف تو منتقل نہیں ہوتا لیکن وہ مذہب اور اس کے حقیقی بہی خواہوں سے مایوس اور بدظن ہو کر بڑے غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں اور اپنے اس منفی طرزِ عمل کے (باقی برصفحہ ۴۸)

دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں

(۳)

۶۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم

مخالفت و مزاحمت کی دوسری تدبیروں کے ساتھ کفار قریش کی ایک نہایت سنگدلانہ تدبیر یہ تھی کہ جس جس کے متعلق ان کو معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، یا جس نے بھی کسی طرح اپنے اسلام کا اظہار کیا، اُس پر انہوں نے بے تحاشا ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا، اور اس کو اسلام لانے سے پھیرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کا کوئی ممکن طریقہ استعمال کرنے سے ذرا دریغ نہ کیا۔ اوّل اوّل تو یہ طریقہ رہا کہ اسلام قبول کرنے والوں میں سے جو لوگ کچھ عزت اور خاندانی شرف و حمایت رکھتے تھے ان سے مل کر ان کو ملامت کی جاتی کہ تم نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ تم سے زیادہ بھلائی اور برائی کی سمجھ رکھنے والے ہیں، اب اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ذلیل و خوار کریں گے، تمہیں احمق ٹھیرائیں گے اور تمہاری عزت خاک میں ملا دیں گے۔ جو لوگ کوئی تجارتی کاروبار یا صنعتی پیشہ کرتے تھے ان کو دھمکیاں دی جاتیں کہ یا تو اسلام چھوڑ دو، نہیں تو تمہاری تجارت برباد کر دی جائے گی اور تمہارے پیشے کو نہیں چلنے دیا جائے گا، یہاں تک کہ تم بھوکے مرنے لگو گے۔ رہے بے سہارا اور کمزور لوگ تو ان کو سخت عذاب دیے جاتے تھے۔ لیکن دفتہ رفتہ نوبت یہ آ گئی کہ عزت دار اور خاندانی لوگوں کو بھی مارا پیٹا اور باندھا جانے لگا۔

خاندانی لوگوں پر مظالم | ابن اسحاق اور طَبَری نے حضرت عُروَہ بن زبیر کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ قریش کے سرداروں نے باہم طے کیا کہ ان کے بیٹوں، بھائیوں اور قبیلہ کے لوگوں میں سے جس جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کی ہے اس پر جبر و ظلم کر کے اُسے زبردستی اِس دین سے پھیرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد مکہ میں حضورؐ کے پیرووں پر ایک فتنۂ عظیم برپا ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ جیسے معزز آدمی کو نَوفل بن خُوَیلِد بن العَدَوِیّہ نے، جو اَسَدِ قریش (قریش کا شیر) کہلاتا تھا، پکڑ کر حضرت طلحہؓ کے ساتھ باندھ دیا، اور اُن کے خاندان بنو تَیم نے اُن کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس پر حضورؐ

نے دُعا فرمائی اللھم اکفنا شر ابن العدویۃ ۔" خدایا، ابن العدویّہ کے شر سے ہم کو بچانے کا تو ہی ذمہ لے لے" (بیہقی۔ ابن سعد)۔ حضرت زبیرؓ بن العوّام کو ان کا چچا ایک چٹائی میں لپیٹ کر لٹکا دیتا تھا اور نیچے سے دھونی دیتا اور کہتا جاتا تھا کہ اسلام سے رجوع کر، مگر وہ برابر یہی جواب دیے جاتے کہ میں کبھی کفر نہ کروں گا (ابن سعد۔ طبرانی)۔ حضرت عثمانؓ کو اُن کے چچا حکم (مروان کے باپ) نے باندھ دیا اور کہا کہ تو باپ دادا کا دین چھوڑ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین قبول کرتا ہے۔ میں تجھے نہیں کھولوں گا جب تک تو اس دین کو چھوڑ نہ دے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا خواہ کچھ ہو جائے (ابن سعد)۔ حضرت مُصعبؓ بن عُمیر کو ان کے چچا زاد بھائی عثمان بن طلحہ (کلید بردارِ کعبہ) نے سخت اذیتیں دیں، اور ان کے اہلِ خاندان نے ان کو قید کر دیا یہاں تک کہ وہ بھاگ نکلے اور پہلی ہجرتِ حبشہ کے موقع پر مہاجرین کے ساتھ چلے گئے (ابن سعد)۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور ان کے بھائی عامر کو ان کی ماں نے بے حد تنگ کیا، مگر وہ اپنے دین سے نہ ہٹے (ابن سعد)۔ انہی کے متعلق مُسند احمد، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی میں آیا ہے کہ حضرت سعدؓ کی ماں حَمْنَہ بنت سُفیان بن اُمیّہ (ابوسفیان کی بھتیجی) نے ان سے کہا، جب تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی، نہ پیوں گی، نہ سایے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا۔" وہ اس پر سخت پریشان ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت اُتری وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا۔ وَاِنْ جَاھَدٰکَ لِتُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا (العنکبوت۔ ۸)۔" اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو اُن کی بات نہ مان"۔

حضرت خالد بن سعید کی سرگذشت

حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص کو جب پتہ چلا کہ ان کے باپ ابواُحَیحہ سعید بن العاص کو ان کے مسلمان ہونے کا علم ہو گیا ہے تو وہ اُس کے ڈر سے چھپ گئے۔ مگر اس نے ان کو تلاش کر کے پکڑوا بلایا اور سخت سُست کہنے کے بعد ان کو اتنا مارا کہ وہ لکڑی ٹوٹ گئی جس سے وہ انہیں مار رہا تھا۔ پھر کہا کہ تو نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کر لی، حالانکہ تو دیکھ رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کی مخالفت کر رہا ہے، دین آبائی میں عیب نکال رہا ہے اور اُن اسلاف کو گمراہ قرار دے رہا ہے جو اس دین کی پیروی کرتے رہے ہیں"۔ حضرت خالدؓ نے کہا خدا کی قسم وہ سچے ہیں اور میں ان کا پیرو ہوں۔ ابواُحَیحہ نے ان کو پھر مارا اور گالیاں دیں اور کہا کہ نالائق،

جہاں تیرا جی چاہے چلا جا، میرے گھر میں تجھے کھانا نہیں ملے گا۔ انہوں نے کہا آپ میرا رزق بند کر دیں گے تو اللہ مجھے رزق دے گا۔ پھر وہ حضورؐ کے پاس آئے اور آپ ہی کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک روز مکّہ کے نواحی میں کسی سنسان جگہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو احیحہ کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ اس نے بلا کر ان سے کہا کہ دینِ محمدؐ چھوڑ دے۔ انہوں نے جواب دیا میں مرتے دم تک یہ دین نہیں چھوڑوں گا۔ یہ جواب سن کر ابو احیحہ نے ان کے سر پر لکڑی مارنی شروع کی یہاں تک کہ لکڑی ٹوٹ گئی۔ پھر انہیں قید کر دیا اور تین دن تک بھوکا پیاسا بند رکھا۔ مکّہ کی گرمی میں حضرت خالدؓ یہ عذاب بھگتتے رہے۔ آخر موقع پا کر گھر سے بھاگ نکلے اور مکّہ کے نواحی میں پھرتے رہے، یہاں تک کہ حَبَشہ کی طرف پہلی ہجرت ہوئی اور یہ ان مہاجرین کے ساتھ چلے گئے (ابن سعد۔ بیہقی نے بھی مختصراً اس واقعہ کا ذکر کیا ہے)۔

حضرت ابوبکرؓ پر ظلم عظیم ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ دارِ اَرقم سے نکل کر مسجد حرام تشریف لے گئے۔ وہاں یکایک حضرت ابوبکرؓ نے اُٹھ کر تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کسی نے حرم میں علی الاعلان دعوتِ اسلام دی ہو۔ مشرکین یہ تقریر سُنتے ہی حضرت ابوبکرؓ پر ٹوٹ پڑے اور اُن کو گرا کر پاؤں سے روندا اور عُتبہ بن رَبیعہ نے ان کے منہ پر اتنے جوتے مارے کہ سارا منہ سوج گیا اور ناک اس میں چھپ گئی۔ یہ حال دیکھ کر ان کے قبیلے والے (بنو تیم) آگے بڑھے اور کفار سے ان کو چھڑا کر ان کے گھر لے گئے۔ انہیں اس امر میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ یہ اب مر جائیں گے، اس لیے وہ پلٹ کر مسجد میں گئے اور کہا کہ خدا کی قسم، اگر ابوبکرؓ مر گئے تو ہم عُتبہ کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔ شام تک حضرت ابوبکرؓ بے سُدھ پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو اُن کا پہلا سوال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ اس پر بنو تیم نے ان کو بُرا بھلا کہا، ملامت کی، اُٹھ کر چلے گئے اور جاتے ہوئے اُن کی والدہ اُمّ الخیر سے کہہ گئے کہ انہیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ماں بیٹے جب تنہا رہ گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی والدہ سے پھر وہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا بخدا مجھے تمہارے دوست کا کچھ حال معلوم نہیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا ذرا اُم جمیل بنت خَطّاب (یعنی فاطمہ بنت خَطّاب، حضرت عمرؓ کی بہنؒ) سے جا کر پوچھیے۔ وہ اُس وقت مسلمان ہو چکی تھیں مگر انہوں نے

لہ طبرانی نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت خطاب کی کُنیت اُمّ جمیل تھی۔ عبدالرزاق نے المُصَنَّف میں امام زُہری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی بہن اُمّ جمیل کے گھر میں قرآن سُن کر ایمان لائے تھے اور دوسری روایات میں ان خاتون کا نام فاطمہ بنت خطاب آیا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی انہی بہن کا نام فاطمہؓ تھا اور انہی کی کُنیت اُمّ جمیل تھی۔

اپنا اسلام چھپا رکھا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی والدہ نے جب جا کر ان سے کہا کہ ابوبکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ کا حال پوچھ رہے ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ کو جانتی ہوں نہ ابوبکرؓ کو، البتہ آپ چاہیں تو میں ابوبکرؓ کے پاس چلتی ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں، چلو۔ وہ آئیں تو حضرت ابوبکرؓ کو بدحال پڑے دیکھ کر چیخ اٹھیں کہ "خدا کی قسم، جن لوگوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ کافر اور فاسق ہیں اور میں اُمید رکھتی ہوں کہ اللہ اُن سے تمہارا انتقام لے گا۔" حضرت ابوبکر نے کہا رسول اللہؐ کا کیا حال ہے؟ اُنہوں نے چپکے سے کہا آپ کی ماں سُن رہی ہیں۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا ان کی فکر نہ کرو، ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔ تب امّ جمیل نے کہا حضورؐ بالکل خیریت سے ہیں۔ پوچھا کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا دارِ اَرقم میں۔ حضرت ابوبکر نے کہا واللہ، میں نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا جب تک اُن کے پاس نہ جاؤں۔ امّ جمیل نے کہا ذرا ٹھیر جائیے۔ پھر جب شہر میں سکون ہو گیا تو وہ اور اُمّ الخیرؓ اُن کو سہارا دے کر دارِ اَرقم لے گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا حال دیکھ کر رِقّت طاری ہو گئی۔ آپؐ اُن پر جھکے اور اُن کو چوم لیا۔ دوسرے مسلمان بھی جو وہاں موجود تھے ان پر جھکے اور ان کی حالت دیکھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا، "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہے سوائے اُس تکلیف کے جو اُس فاسق نے میرے منہ پر جوتے برسا کر پہنچائی۔ یہ میری ماں اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ بابرکت ہیں۔ اِن کو اللہ کی طرف دعوت دیجیے اور دُعا فرمایئے کہ اللہ ان کو آگ سے بچا لے۔" چنانچہ حضورؐ نے ان کے لیے دُعا کی اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئیں۔ یہ واقعہ حافظ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں حافظ ابوالحسن خَیثمہ بن سلیمان الاَطرابلسی کی کتاب "فضائل الصحابہ" سے بتفصیل نقل کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے اِصابہ میں اسے مختصراً امّ الخیرؓ کے حالات میں بیان کیا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو بُری طرح مارا جاتا ہے ابنِ اسحاق حضرت عُروہ بن زُبیر سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک روز صحابہ کرامؓ نے آپس میں کہا کہ قریش نے کبھی کسی کو (یعنی ہم میں سے کسی کو) عَلانیہ باوازِ بلند قرآن پڑھتے نہیں سُنا ہے، ہم میں کون ہے جو ایک دفعہ اُن کو یہ کلام پاک سُنا ڈالے؟ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے کہا میں یہ کام کرتا ہوں۔ صحابہ نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ وہ تم پر زیادتی کریں گے۔ ہمارے خیال میں کسی ایسے شخص کو یہ کام کرنا چاہیے جس کا خاندان زبردست ہو، تاکہ اگر قریش کے لوگ اُس پر دست درازی کریں تو اُس کے خاندان والے اس کی حمایت پر اُٹھ کھڑے ہوں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا مجھے یہ کام کر ڈالنے دو، میرا محافظ اللہ ہے۔ پھر وہ دن چڑھے حرم میں پہنچے جبکہ قریش کے سردار وہاں اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے مقامِ ابراہیم پر

پہنچ کر پورے زور سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ قریش کے لوگ پہلے تو سوچتے رہے کہ عبداللہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر جب انہیں پتہ چلا کہ یہ وہ کلام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو وہ اُن پر ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر تھپیڑ مارنے لگے۔ مگر حضرت عبداللہ نے پروا نہ کی۔ پٹتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب تک اُن کے دَم میں دَم رہا قرآن سُناتے چلے گئے۔ آخرکار جب وہ اپنا سُوجا ہوا منہ لے کر پلٹے تو ساتھیوں نے کہا ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا۔ اُنہوں نے جواب دیا آج سے بڑھ کر یہ خدا کے دشمن میرے لیے کبھی ہلکے نہ تھے، تم کہو تو کل پھر اِنہیں قرآن سُناؤں۔ سب نے کہا بس اتنا ہی کافی ہے۔ جو کچھ وہ نہیں سُننا چاہتے تھے وہ تم نے انہیں سُنا دیا۔ (ابن ہشام۔ جلد اوّل، ص ۳۳۶)

بے کس غلاموں، لونڈیوں اور موالی پر ظلم سب سے زیادہ دردناک مظالم اُن غلاموں، لونڈیوں اور موالی پر توڑے گئے جو اسلام لے آئے تھے اور جن کا مکہ میں کوئی پُشت پناہ نہ تھا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

حضرت بلالؓ ان میں سے ایک حضرت بلالؓ بن رَباح تھے جو بنی جُمَح میں سے کسی کے غلام تھے اور غلامی کی حالت ہی میں ان کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ حبشی تھے، جیسا کہ طبرانی وغیرہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ ان کے اسلام لانے کا حال جب کھلا تو اُمَیّہ بن خَلَف جُمَحی نے ان کو طرح طرح کے عذاب دیے۔ ابن ہشام اور بَلاذُری نے لکھا ہے کہ وہ دوپہر کو سخت گرمی کے وقت انہیں نکال کر لے جاتا، مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا اور کہتا کہ خدا کی قسم تو اِسی طرح پڑا رہے گا جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر کے لات اور عزّیٰ کی عبادت نہ کرے۔ مگر وہ جواب میں بس اَحَدٌ اَحَدٌ ہی کہے چلے جاتے۔ بَلاذُری نے حضرت عَمروؓ بن العاص کی روایت نقل کی ہے کہ میں نے بلالؓ کو ایسی سخت تپتی ہوئی زمین پر لیٹے دیکھا ہے جس پر اگر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ پک جاتا۔ مگر وہ اس حالت میں بھی صاف کہہ رہے تھے کہ میں لات اور عُزّیٰ کا انکار کرتا ہوں حضرت حَسّانؓ بن ثابت کا آنکھوں دیکھا حال بلاذری نے نقل کیا ہے کہ میں حج (یا عمرے) کے لیے مکہ گیا تو دیکھا کہ بلالؓ ایک رسّی سے بندھے ہوئے ہیں اور لڑکے اُن کو گھسیٹے پھر رہے ہیں، مگر وہ کہے جا رہے ہیں کہ میں لات اور عزّیٰ اور ہُبَل اور اِساف اور نائلہ اور بُوانہ، سب کا انکار کرتا ہوں۔" خود حضرت بلالؓ کا بیان بلاذری میں یہ ہے کہ مجھے ایک دفعہ ایک دن اور ایک رات پیاسا رکھا گیا اور تپتی ہوئی ریت پر لے جا کر ڈال دیا گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کے گلے میں رسّی باندھ کر ان کو لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا اور وہ مکے کی گھاٹیوں میں انہیں گھسیٹے لیے پھرتے۔ پھر تپتی ہوئی ریت پر لا کر اوندھے منہ لٹا دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ ایسے ہی اور

سخت عذاب دے دے کر ان سے کہا جاتا کہ تمہارے رب لات اور عُزّٰی ہیں۔ مگر وہ احد احد ہی کہتے رہتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا گھر بنی جُمَح کے محلے ہی میں تھا۔ وہ یہ ظلم دیکھتے دیکھتے تنگ آگئے۔ ابن ہشام کی روایت ہشام بن عُروَہ سے یہ ہے کہ انہوں نے اپنا ایک تنومند حبشی غلام ان کے بدلے میں دے کر انہیں خرید لیا اور آزاد کر دیا۔ اور ابن ابی شَیبہ نے قیس بن حازم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قیمت دے کر انہیں خریدا اور آزاد کیا تھا۔ اسی مضمون کی روایات ابن سعد نے بھی نقل کی ہیں۔ البتہ قیمتوں میں اختلاف ہے۔

حضرت عمّارؓ بن یاسر ابن سعد کا بیان ہے کہ یاسر یمن کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے مکہ آئے اور ابو حذیفہ بن مُغیرہ مخزومی سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا اور ابو حذیفہ نے اپنی لونڈی سُمَیّہ سے ان کی شادی کر دی۔ جب اسلام آیا تو یاسرؓ، سُمیّہؓ، عمّارؓ اور ان کے بھائی عبد اللہؓ سب مسلمان ہو گئے۔ اس پر پورا خاندان سخت مبتلائے عذاب کر دیا گیا۔ بَلاذُری نے اُمِّ ہانیؓ سے اور طبرانی نے حضرت عثمانؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس مقام سے گزر رہے تھے جہاں اِن لوگوں کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ آپ کو اس پر سخت رنج ہوا اور آپ نے فرمایا صبرًا آل یاسر فان موعدکم الجنۃ۔ "صبر کرو اے آل یاسر، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے"۔ امام احمد اور ابن سعد نے حضرت عثمانؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضورؐ کے ساتھ اُس مقام سے گزرے جہاں اِس خاندان کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا "صبر کرو، یا اللہ آل یاسر کی مغفرت فرما دے، اور تُو نے تو ان کی مغفرت کر ہی دی"۔ محمد بن کعب قُرَظی کا بیان ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمّارؓ کو ایک مرتبہ کُرتا اتارے ہوئے دیکھا تو ان کی پیٹھ پر داغ ہی داغ نظر آئے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ اُس عذاب کے نشانات ہیں جو مکہ کی تپتی ہوئی زمین پر مجھے دیے جاتے تھے۔ عَمرو بن مَیمون کے حوالہ سے ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے حضرت عمّارؓ کو آگ کے انگاروں سے داغا اور حضورؐ نے فرمایا "اے آگ عمار پر اُسی طرح ٹھنڈی ہو جا جس طرح تو ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہوئی تھی"۔ آخر کار اُن کے والد یاسرؓ عذاب کی سختیاں سہتے سہتے انتقال کر گئے۔ پھر ابوجہل نے ان کی والدہ سُمیّہؓ کو قتل کر دیا۔ اُن کے بھائی عبد اللہؓ کو تیر مارا گیا اور وہ گر گئے۔ اب صرف حضرت عمّارؓ رہ گئے تھے۔ ان کو پانی میں غوطے دیے گئے یہاں تک کہ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے حضورؐ کا انکار اور ان کے معبودوں کی تعریف کر کے جان چھڑائی۔ پھر روتے ہوئے حضورؐ کے پاس آئے اور یہ حال بیان کیا۔ آپ نے پوچھا اپنے دل کی کیا کیفیت پاتے ہو؟ عرض کیا کہ بالکل ایمان پر مطمئن۔ آپ نے فرمایا اگر آئندہ ایسا موقع آئے تو پھر بھی یہی کچھ کہہ دینا۔ بیہقی، ابن سعد، ابن جریر،

بلاذری، عَوفی وغیرہم نے یہ واقعہ نقل کر کے متعدد مفسرین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سورۂ نحل کی آیت ۱۰۶ اسی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے، وہ اگر مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو تب تو معاف ہے، البتہ جو شرحِ صدر کے ساتھ کُفر اختیار کرلے اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس کے لیے سخت عذاب ہے۔

حضرت خبّابؓ بن الأرت | یہ اصل میں عراقی تھے۔ قبیلۂ ربیعہ میں سے ایک گروہ نے ان کو پکڑ کر غلام بنالیا اور مکہ لا کر بنی خزاعہ کے ایک خاندان آلِ سباع کے ہاتھ بیچ دیا جو بنی زُہرہ کا حلیف تھا۔ یہ ایک کاریگر آدمی تھے۔ لوہاری کا پیشہ کرتے اور تلواریں بنایا کرتے تھے۔ مسلمان ہونے کے قصور میں پہلے تو انہیں پیٹ کی مار دی گئی۔ مُسند احمد، بخاری اور مسلم میں خود ان کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ میرا کچھ قرض عاص بن وائل سَہمی پر آتا تھا۔ میں اس کے پاس تقاضے کے لیے جاتا تو وہ کہتا کہ میں تجھے کچھ نہ دوں گا جب تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار نہ کرے۔ میں اس کو جواب دیتا کہ میں ہرگز ان کا انکار نہ کروں گا خواہ تو مرے اور پھر زندہ ہو۔ ابن سعد میں ہے کہ اس پر عاص کہتا کہ "اچھا تو مرنے کے بعد پھر جب میں اپنے مال اور اولاد کی طرف پلٹوں گا تو ادا کردوں گا"۔ ابن ہشام نے یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ عاص نے ان سے بہت سی تلواریں بنوائیں اور قرض بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے جب تقاضا کیا تو اس نے کہا کہ تیرا یہ صاحب، جس کے دین پر تو ہے، کہتا ہے کہ جنت میں بہت سونا چاندی کپڑا اور خدمت گار ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا تو پھر مجھے قیامت تک مہلت دے۔ وہاں میں ادا کردوں گا کیوں کہ وہاں تُو اور تیرا صاحب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھ سے زیادہ مقبول نہ ہوں گے۔ اس طرح پیٹ کی مار دینے سے بھی جب ظالموں کا دل نہ بھرا تو انہوں نے ان کو سخت عذاب دینے شروع کیے۔ ابن سعد اور بلاذری نے شَعبی کی روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں انہوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی جو بالکل برص کے مریض کی کھال جیسی ہو رہی تھی، اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ مشرکین نے آگ جلا کر مجھے اس پر گھسیٹا، پھر ایک شخص میرے سینے پر کھڑا ہوگیا اور میری چربی پگھلنے سے آگ بجھ گئی۔

حضورؐ سے حضرت خبّابؓ کی فریاد اور آپؐ کا جواب | انہی مظالم کے زمانہ کا وہ واقعہ ہے جو امام احمد بن حنبل، بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے خود حضرت خبّاب سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں مشرکین کی سختیوں سے ہم بُری طرح تنگ آئے ہوئے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی دیوار کے سایے

میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ، اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ ہمارے لیے دُعا نہیں فرماتے؟" یہ سن کر آپ کا چہرۂ مبارک تمتما اُٹھا اور آپ نے فرمایا "تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گذر چکے ہیں اُن پر اس سے سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے جاتے، اور کسی کے جوڑوں پر لوہے کے کنگھے گھسے جاتے تھے تاکہ وہ ایمان سے باز آجائے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب ایک شخص صنعاء سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو"۔

حضرت ابوبکرؓ کا مظلوم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا اس ظلم و ستم کے دور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بے تحاشا دولت خرچ کر کے متعدد مظلوم غلاموں اور لونڈیوں کو خرید خرید کر آزاد کر دیا۔ ابن ہشام نے ایسے سات افراد کے نام لیے ہیں۔ لیکن بیہقی، ابن اسحاق، ابن عبدالبرؒ اور ابن حجرؒ وغیرہ نے جو نام گنائے ہیں ان کو جمع کرنے سے جملہ ۹ افراد کی تعداد بنتی ہے۔

(۱) حضرت بلالؓ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) اُن کی والدہ حمامہؓ۔ ابن عبدالبرؒ نے بیان کیا ہے کہ ان کو بھی راہ خدا میں عذاب دیا جاتا تھا۔

(۳) عامرؓ بن فُہیرہ۔ ابن سعد، طبری اور بلاذری نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کے ماں جائے بھائی طُفیل بن الحارث کے غلام تھے اور اُن مظلوموں میں شامل تھے جنہیں عذاب دیا جاتا تھا۔

(۴) ابوفکیہہ۔ ان کے متعلق ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اُمیّہ بن خلف ان کو سخت عذاب دیتا تھا۔ اور طبقات ابن سعد اور اُسد الغابہ میں ہے کہ بنی عبدالدار کے کچھ لوگ، جن کی غلامی میں یہ تھے، انہیں دوپہر کے وقت سخت گرمی میں نکالتے، لوہے کی بیڑیاں پہنا کر اُن کو تپتی ہوئی زمین پر اوندھا لٹا دیتے اور ان کی پیٹھ پر پتھر رکھ دیتے، یہاں تک کہ یہ ہوش گم کر بیٹھتے۔

(۵) لُبینہ یا لُبیبہ۔ بلاذری نے ان کا نام لکھا ہے اور ابن ہشام نے نام لیے بغیر ان کا ذکر بنی مُؤمّل (بنی عدی کی ایک شاخ) کی لونڈی کی حیثیت سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ عمر بن خطاب اپنے زمانۂ کفر میں اُن کو خوب مارتے اور جب مارتے مارتے تھک جاتے تھے تو کہتے کہ میں نے صرف تھک جانے کی وجہ سے تجھے چھوڑا ہے، اور یہ جواب دیتیں کہ اللہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی کرے۔

(۶-۷) نَہدِیَّہ اور ان کی بیٹی - یہ دونوں بنی عبد الدار کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں - ان کی مالکہ بھی ان پر ظلم کرتی تھی -

(۸) زِنّیرَہ (استیعاب میں ان کا نام زَنّبرَہ لکھا ہے) - ابن اثیر نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ یہ بنی عدی کی لونڈی تھیں اور عمر بن خطاب ان کو عذاب دیتے تھے - اور دوسری روایت یہ ہے کہ بنی مخزوم کی لونڈی تھیں اور ابوجہل ان کو عذاب دیتا تھا، یہاں تک کہ ان کی بینائی جاتی رہی - ابوجہل نے کہا لات اور عزّٰی نے تجھے اندھا کر دیا - انہوں نے کہا لات اور عزّٰی کو تو خبر بھی نہیں کہ انہیں کون پوج رہا ہے، یہ فیصلے تو آسمان سے ہوتے ہیں اور میرا رب اس پر قادر ہے کہ میری بینائی واپس دے دے - چنانچہ دوسرے روز وہ اُٹھیں تو اللہ نے ان کی بینائی بحال کر دی تھی - یہی بلاذری کی روایت ہے - مگر ابن ہشام نے اس کے برعکس یہ لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکر نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تو ان کی بینائی جاتی رہی - قریش کے لوگوں نے اس پر کہنا شروع کیا کہ لات و عزّٰی نے اسے اندھا کر دیا - انہوں نے کہا بیت اللہ کی قسم، یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں - لات و عزّٰی کسی کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان - اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی بحال فرما دی -

(۹) اُم عُبَیس (بعض نے عُنَیس اور بعض نے عُمَیس لکھا ہے) - بلاذری نے لکھا ہے کہ یہ بنی زُہرہ کی لونڈی تھیں اور اَسود بن عبد یغوث ان پر ظلم ڈھاتا تھا -

حضرت ابوبکرؓ کے والد کا اعتراض اور آپ کا ان کو جواب

ابن اسحاق، ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح ان غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیہ خرچ کرتے دیکھ کر ان کے والد ابوقُحافہ نے (جو اُس وقت مشرک تھے) ان سے کہا کہ بیٹا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کرا رہے ہو - اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لیے قوتِ بازو بنتے - حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ "ابا جان میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے"۔ یہ واقعہ سورۂ لیل کی اُس آیت کا بہترین مصداق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "جہنم کی اس آگ سے دُور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار آدمی جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے، اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو - وہ تو صرف اپنے ربِ برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے"۔ (آیات ۱۷ تا ۲۰) - یعنی وہ اپنا مال جن لوگوں پر صرف کرتا ہے ان کا کوئی احسان پہلے سے اس پر نہ تھا کہ وہ اس کا بدلہ چکانے کے لیے، یا آئندہ ان سے مزید فائدہ اُٹھانے کے لیے ان کو ہدیے اور تحفے دے رہا ہو اور ان کی دعوتیں کر رہا ہو، بلکہ وہ اپنے ربِ برتر کی رضا جوئی کے لیے ایسے لوگوں

کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے اس پر کوئی احسان تھا، نہ آئندہ ان سے وہ کسی احسان کی توقع رکھتا ہے۔

ظلم کے نتائج قریش نے مسلمانوں پر ظلم ڈھا کر بظاہر یہ فائدہ اُٹھانا چاہا تھا کہ لوگوں پر خوف طاری کر کے اسلام کے پھیلاؤ کو روک دیں۔ لیکن اس کے جو نتائج فی الواقع نکلے وہ اُن کی توقعات کے بالکل خلاف تھے۔ اوّل تو اس سے یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی کہ اسلام جو اخلاق اور دلائل لے کر آیا ہے اُن کا کوئی جواب کُفر کے پاس اِن خلافِ انسانیت حربوں کے سوا نہیں ہے۔ دوسرے اس بے رحمی و سنگدلی کو دیکھ کر ہر نیک سرشت انسان کی فطرت کُفر اور اس کے علمبرداروں سے نفرت کرنے لگی، اور جس صبر و استقامت کے ساتھ مسلمانوں نے اس بے جا ظلم کو برداشت کیا اس کی وجہ سے تمام غیر متعصب دلوں میں ان کے لیے ہمدردی بھی پیدا ہوئی اور قدر و منزلت بھی۔ بلکہ درحقیقت اُس نے اسلام کی دھاک بٹھا دی کہ کیسے ہی کے معاشرے میں سے اُس کو ایسے پختہ، اولوالعزم اور زبردست قوتِ ایمانی رکھنے والے انسان مل گئے ہیں جو کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں، صرف حق کی خاطر ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل سکتے ہیں۔ پھر کفار کے یہ حربے اسلام کے پھیلاؤ کو بھی نہ روک سکے۔ اس ظلم کے باوجود ایسے اللہ کے بندے نکلتے ہی رہے جنہوں نے کُفّار کے علی الرّغم اسلام قبول کیا اور بہت سے لوگ دل میں ایمان لے آئے مگر اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا جس کی وجہ سے اعدائے اسلام کبھی یہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ ان کے درمیان اس دین کے کتنے حامی چھپے ہوئے ہیں جن کی پوشیدہ حمایت کُفر کے حصار میں بڑے رخنے ڈال سکتی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ اِس ظلم کا اسلام کو یہ پہنچا کہ اس بھٹی سے گذر کر جو لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے وہ نسلِ آدم کے بہترین انسان تھے۔ اس حالت میں کوئی کمزور سیرت و کردار کا آدمی اس طرف رُخ بھی نہ کر سکتا تھا۔

ایک اور زمانۂ فترۃ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کام بھی نرالے ہیں جنہیں عقلِ نارسا کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ عین وہ زمانہ جبکہ کفر و اسلام کی یہ کشمکش اس شدت کو پہنچی ہوئی تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت گذر رہا تھا، بظاہر تو اس بات کا مقتضی تھا کہ حضورؐ پر وحی کا نزول پیہم جاری رہتا، جس میں ہر روز پیش آنے والے نت نئے حالات میں رہنمائی بھی ہوتی، نبیؐ و اصحابِ نبیؐ کے لیے تسلی اور ہمت افزائی بھی ہوتی، اور کفار کے لیے ان مظالم پر تہدید بھی۔ لیکن اسی زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکایک نزولِ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا، جس پر حضورؐ بھی سخت پریشان ہوئے اور کفار کو بھی باتیں بنانے کا خوب موقع ملا۔

اِس فترۃِ وحی کا زمانہ ٹھیک کونسا تھا، یہ تو معلوم نہیں ہے، مگر اس سلسلہ میں جو روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں ان سے بھی، اور خود اُن دو سورتوں کے مضمون سے بھی جو اس فترۃ کے خاتمہ پر نازل ہوئیں صاف معلوم

ہوتا ہے کہ یہ دعوتِ عام شروع ہو جانے اور کارزارِ کفر و اسلام کا میدان گرم ہو جانے کے بعد پیش آیا تھا۔ مختلف روایات میں اس فَترۃ کی مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ ابن جُرَیج نے ۱۲ روز، الکَلبی نے ۱۵ روز، ابنِ عباس نے ۲۵ روز، سُدّی اور مُقاتِل نے ۴۰ روز اس کی مدت بیان کی ہے۔ بہرحال یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُس پر سخت غمگین ہو گئے تھے، اور مخالفین بھی آپ کو طعنے دینے لگے تھے، کیونکہ حضوؐر پر جو نئی سورۃ نازل ہوتی تھی، اُسے آپؐ لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپؐ نے کوئی نئی وحی لوگوں کو نہ سُنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ جُندُب بن عبداللہ البجلیؓ کی روایت ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے آنے کا سلسلہ رُک گیا تو مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے رب نے چھوڑ دیا (ابن جریر۔ طبرانی، عَبد بن حُمید، سعید بن منصور، ابنِ مَردُوْیَہ)۔

دوسری روایات میں مذکور ہے کہ ابولہب کی بیوی امِّ جمیل نے، جو حضوؐر کی چچی تھی اور جس کا گھر حضوؐر کے مکان سے متصل تھا، آپؐ سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے"۔ عَوفی اور ابن جریر نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ کئی روز تک جبریلؑ کی آمد رک جانے سے حضوؐر پریشان ہو گئے اور مشرکین کہنے لگے کہ ان کا رب ان سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ قتادہ اور ضَحّاک کی مُرسَل روایات میں بھی قریب قریب یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اس صورتِ حال میں حضوؐر کے شدید رنج و غم کا حال بھی متعدد روایات میں آیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ محبوب کی طرف سے بظاہر عدم التفات، کُفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اُسی ذریعہ طاقت سے بظاہر محرومی جو اس جانگسل کشمکش کے منجدھار میں آپؐ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اُس پر مزید دشمنوں کی شماتت، یہ ساری چیزیں مل جل کر لامحالہ حضوؐر کے لیے سخت پریشانی کی موجب ہو رہی ہوں گی اور آپ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہوگا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

سورۂ ضحیٰ کا نزول اس پر سورۂ ضحیٰ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا:

وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا
وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝
(آیت ۱-۳)

"قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے، اے نبیؐ، تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔"

یعنی جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون لیے ہوئے چھا جانا کچھ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت ان سے ناراض ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت و مصلحت کے تحت طاری ہوتی ہیں، اسی طرح کبھی تم پر وحی بھیجنا اور کبھی اس کو روک لینا بھی حکمت و مصلحت ہی کی بنا پر ہے، اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تم سے خوش ہو تو وحی بھیجے اور جب وہ وحی نہ بھیجے تو اس کے معنی یہ ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اُسے تھکا دے، اس لیے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ دن کے بعد رات آئے تاکہ اس میں انسان کو سکون ملے۔ اسی طرح وحی کی روشنی اگر تم پر پے در پے پڑتی رہے تو تمہارے اعصاب اس کو برداشت نہ کر سکیں گے، اسی لیے وقتاً فوقتاً فَتْرَۃ (وحی بند رہنے) کا ایک زمانہ بھی اللہ تعالیٰ نے اس مصلحت کی بنا پر رکھا ہے کہ نزولِ وحی سے جو بار تم پر پڑتا ہے اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور تمہیں سکون حاصل ہو جائے۔[۱]

اس کے بعد فرمایا:

وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی (آیت ۴) "اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہے۔"

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مٹھی بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے، ساری قوم مخالفت پر تُلی ہوئی تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور تک کہیں نظر نہ آ رہے تھے، اسلام کی شمع مکے ہی میں ٹمٹما رہی تھی، اور اس کو بجھانے کے لیے ہر طرف طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ

---

[۱] نزولِ وحی کا بار حضوؐر پر کس قدر شدید پڑتا تھا اس کا اندازہ اُن روایات سے ہوتا ہے جو اس کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپؐ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا سخت بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے زمانے میں حضوؐر پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپ کی پیشانی سے اس وقت پسینہ ٹپکنے لگتا تھا (بخاری، مسلم، مالک، ترمذی، نسائی)۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپ اُونٹنی پر بیٹھے ہوتے تو اُونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اُس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزولِ وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا (مسند احمد، حاکم، ابن جریر)۔

نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپ ذرا پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپؐ کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزّت وشوکت اور آپ کی قدر ومنزلت بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کا نفوذ واثر پھیلتا جائے گا۔ اور یہ وعدہ دنیا ہی تک کے لیے نہیں ہے بلکہ آخرت آپ کے لیے دُنیا سے بھی بہتر ہوگی۔

پھر فرمایا:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (آیت ۵) "اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔

یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا وبخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضوؐر کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا ملک عرب جنوب کے سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحرِاحمر تک آپؐ کے زیرنگیں ہو گیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہوگئی۔ جو طاقت بھی اس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہوکر رہ گئی۔ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے وہ پورا ملک گونج اُٹھا جس کے مشرکین اور اہل کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخر ہوگئے، اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ایک قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضوؐر کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت سے اُٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر چھا گئی اور دُنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دُنیا میں دیا، اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔

اسلام کس چیز کا علمبردار ہے

(اپریل کے آغاز میں اسلامک کونسل آف یورپ لندن میں ایک کانفرنس کر رہی ہے - یہ مقالہ اُسی کی فرمائش پر لکھ کر بھیجا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ اپنی بیماری کے باعث میں خود وہاں نہ جا سکا)

۱ - ابتداء ہی میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق اسلام کسی ایسے دین کا نام نہیں ہے جسے پہلی مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہو اور اِس بنا پر آپ کو بانی اسلام کہنا صحیح ہو۔ قرآن اس امر کی پوری صراحت کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے نوعِ انسانی کے لیے ہمیشہ ایک ہی دین بھیجا گیا ہے، اور وہ ہے اسلام — خدا کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا۔ دُنیا کے مختلف حصّوں اور مختلف قوموں میں جو انبیاء بھی خدا کے بھیجے ہوئے آئے تھے، وہ اپنے کسی الگ دین کے بانی نہیں تھے کہ ان میں سے کسی کے لائے ہوئے دین کو نُوحیّت، اور کسی کے دین کو ابراہیمیت، یا موسویت، یا عیسائیت کہا جا سکے۔ بلکہ ہر آنے والا نبی اُسی ایک دین کو پیش کرتا رہا جو اُس سے پہلے کے انبیاء پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔[1]

۲ - انبیاء میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت دراصل یہ ہے کہ (۱) وہ خدا کے آخری نبی ہیں۔ (۲) ان کے ذریعہ سے خدا نے اُسی اصل دین کو پھر تازہ کر دیا جو تمام انبیاء کا لایا ہوا تھا۔ (۳) اُس میں جو آمیزشیں مختلف زمانوں کے لوگوں نے کر کے الگ الگ مذاہب (RELIGIONS) بنا لیے تھے اُن سب کو خدا نے چھانٹ کر الگ کر دیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اصلی اور خالص اسلام کی تعلیم نوعِ انسانی کو دی۔ (۴) اُن کے بعد چونکہ خدا کو کوئی نبی بھیجنا نہیں تھا اس لیے اُن کو جو کتاب اُس نے دی اُسے اُس کی اصل زبان میں لفظ بلفظ محفوظ کر دیا،[2]

---

[1] الاحقاف: ۹ — آل عمران: ۱۹، ۶۷، ۸۳ تا ۸۵ — یونس: ۷۲، ۸۴ — البقرہ: ۱۲۸، ۱۳۱ تا ۱۳۳ — یوسف: ۱۰۱ — المائدہ: ۴۴، ۱۱۱ — النمل: ۴۴ —

[2] الاحزاب: ۴۰ — الشوریٰ: ۱۳ — آل عمران: ۸۴ — البیّنہ: ۱، ۲، ۳ — الحجر: ۹ — البروج: ۲۲ —

تاکہ انسان ہر زمانے میں اس سے ہدایت حاصل کر سکے[1]۔ (۵) خود اُن کی سیرت اور سُنّت کو صحابہؓ اور بعد کے محدثین نے ایسے بے مثل طریقے سے محفوظ کر لیا جس سے زیادہ محفوظ طریقہ سے کبھی کسی نبی یا کسی اور تاریخی شخصیت کے حالاتِ زندگی اور اس کے اقوال و اعمال محفوظ نہیں کیے گئے[2]۔ (۶) اس طرح قرآن مجید اور اس کے لانے والے نبی کی مستند سیرت و سُنّت، دونوں باہم مل کر ہمیشہ کے لیے یہ معلوم کرنے کا قابلِ اعتماد ذریعہ بن گئے ہیں کہ

---

[1] قرآن مجید کے متعلق یہ امر ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ بلا کسی تغیّر و تبدّل کے ٹھیک وہی قرآن مجید ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ اس کے نزول کے وقت ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لکھواتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ آپؐ کی وفات تک جاری رہا۔ اس مکمل قرآن مجید کو آپؐ کے پہلے خلیفہ نے ایک کتاب کی شکل میں نقل کرا کے محفوظ کر لیا اور پھر تیسرے خلیفہ نے اس کی نقلیں تمام اسلامی دُنیا کے مراکز میں بھیج دیں۔ اُس وقت سے لے کر آج تک ہر ملک اور ہر صدی کے مکتوبہ اور مطبوعہ قرآن جمع کر کے دیکھ لیا جائے، ان میں کوئی فرق نہیں پایا جائے گا۔ اس کے علاوہ نماز میں قرآن مجید پڑھنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے پہلے ہی دن سے دے دیا گیا تھا۔ اس لیے سینکڑوں صحابۂ کرام نے پورا قرآن مجید، اور تمام صحابہ کرام نے اس کا کوئی نہ کوئی حصّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں یاد کر لیا تھا۔ اُس وقت سے آج تک قرآن مجید کو لفظ بلفظ یاد کرنے اور ہر سال رمضان کی نماز تراویح میں پورا قرآن مجید زبانی سُنانے کا سلسلہ پوری اسلامی دنیا میں رائج چلا آرہا ہے اور ہر زمانے میں لاکھوں حافظ موجود رہے ہیں۔ دُنیا کی کوئی مذہبی کتاب بھی اس طرح نہ تحریری شکل میں مکتوب اور نہ حافظوں میں محفوظ ہوئی ہے کہ اس کی صحت میں شک کا ادنیٰ امکان تک نہ ہو۔

[2] مختصراً وہ طریقہ یہ تھا کہ جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان کرتا اُسے لازماً یہ بتانا پڑتا تھا کہ اُس تک کن راویوں کے ذریعہ سے وہ بات پہنچی ہے، اور روایت کا یہ سلسلہ کسی ایسے شخص تک پہنچتا ہے یا نہیں جس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ بات سُنی ہو، یا آپؐ کو وہ کام کرتے دیکھا ہو۔ پھر جن جن راویوں کے ذریعہ سے یہ روایات بعد کے لوگوں تک پہنچیں ان کے حالات کی جانچ پڑتال کی گئی تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ان کی بیان کی ہوئی روایات قابلِ اعتماد ہیں یا نہیں۔ اِس طرح احادیث کے مجموعے تیار کیے گئے جن کے مرتب کرنے والوں نے ہر حدیث کے راویوں کا پورا سلسلہ درج کر دیا، اور اس کے ساتھ راویوں کے حالات پر بھی کتابیں لکھ دی گئیں جن کی مدد سے آج بھی ہم یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کیسی تھی اور انہوں نے اپنے قول و عمل سے لوگوں کو کیا تعلیم دی تھی۔

خدا کا دین دراصل کیا ہے، کیا رہنمائی وہ ہمیں دیتا ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے۔

۳۔ اگرچہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں ــــ اُن پر بھی جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور اُن پر بھی جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا[۲] ــــ اور یہ ایمان ہمارے عقیدے کا ایسا لازمی ستون ہے جس کے بغیر ہم مسلمان نہیں ہو سکتے[۳]، لیکن ہدایت حاصل کرنے کے لیے ہم صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ (۱) وہ آخری نبی ہیں اس لیے ان کی لائی ہوئی تعلیم خدا کی طرف سے جدید ترین ہدایت (LATEST DISPENSATION) ہے، (۲) اُن کے ذریعے سے جو کلام اللہ (WORD OF GOD) ہم کو پہنچا ہے وہ خالص اللہ کا کلام ہے جس کے ساتھ کسی انسانی کلام کی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنی اصل زبان میں محفوظ ہے، اس کی زبان ایک زندہ زبان ہے جسے آج بھی کروڑوں انسان بولتے، لکھتے اور سمجھتے ہیں، اور اس زبان کی گرامر، لغت، محاورے، تلفظ اور املا میں نزولِ قرآن کے زمانے سے اب تک کوئی تغیر نہیں آیا ہے، اور (۳) جیسا کہ ابھی میں بیان کر چکا ہوں اُن کی سیرت، اخلاق، کردار، اقوال اور اعمال کے متعلق پورا تاریخی ریکارڈ زیادہ سے زیادہ ممکن صحت، اور زیادہ سے زیادہ ممکن تفصیلات کے ساتھ محفوظ ہے۔ یہ بات چونکہ دوسرے انبیاء پر صادق نہیں آتی اس لیے ہم اُن پر صرف ایمان رکھ سکتے ہیں، عملاً اُن کی پیروی نہیں کر سکتے۔

۴۔ ہمارے عقیدے کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام دنیا کے لیے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ اس لیے کہ (۱) قرآن مجید اس کی صراحت کرتا ہے[۴]۔ (۲) یہ اُن کے آخری نبی ہونے کا منطقی تقاضا ہے، کیونکہ دنیا میں ایک نبی کے آخری نبی ہونے سے خود بخود یہ لازم آتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے اور اپنے بعد آنے والے ہر زمانے کے لیے ہادی و رہبر ہو۔ (۳) اُن کے ذریعہ سے وہ ہدایت مکمل طور پر دے دی گئی ہے جو راہ راست پر چلنے کے لیے انسان کو درکار ہے[۵]، اور یہ بھی اُن کے آخری نبی ہونے کا منطقی تقاضا ہے، کیونکہ مکمل ہدایت کے بغیر جو نبی بھیجا گیا ہو وہ آخری نبی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے بعد پھر ایک نبی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ (۴) اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ان کے بعد پچھلے چودہ سو سال میں کوئی ایسی شخصیت نہیں

---

[۱] المؤمن: ۷۸۔ [۲] البقرہ: ۲۸۵۔ النساء: ۱۵۰ تا ۱۵۲۔

[۳] الاعراف: ۱۵۸۔ الانعام: ۱۹۔ سبا: ۲۸۔ التکویر: ۲۷۔ [۵] المائدہ: ۳۔

آئی ہے جو خدا کی طرف سے نبی ہونے کا دعوی کرنے کے ساتھ اپنی سیرت و کردار اور اپنے کام اور کلام میں انبیاء سے کوئی ادنیٰ درجے کی بھی مشابہت رکھتی ہو، جس نے حامل وحی ہونے کا دعوی کر کے کوئی ایسی کتاب پیش کی ہو جو خدائی کلام سے برائے نام بھی کوئی مناسبت رکھتی ہو اور جسے شریعت دینے والا (LAW GIVER) نبی کہا جا سکتا ہو۔

۵ ۔ گفتگو کے اس مرحلے پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے انسان کو کس خاص علم کی ضرورت ہے جو صرف انبیاء ہی کے ذریعہ سے دیا گیا ہے ؟

دنیا میں ایک قسم کی چیزیں وہ ہیں جنہیں ہم اپنے حواس کے ذریعہ سے محسوس کر سکتے ہیں یا اپنے فنی آلات (SCIENTIFIC INSTRUMENTS) سے کام لے کر ان کا ادراک کر سکتے ہیں اور ان ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو مشاہدات و تجربات اور فکر و استدلال کی مدد سے مرتب کر کے نئے نئے نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی اشیاء کا علم خدا کی طرف سے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہماری اپنی تلاش و جستجو، غور و فکر اور تحقیق و اکتشاف کا دائرہ ہے۔ اگرچہ اس معاملہ میں بھی ہمارے خالق نے ہمارا ساتھ بالکل چھوڑ نہیں دیا ہے۔ تاریخ کے دوران میں وہ غیر محسوس طریقے سے ایک تدریج کے ساتھ اپنی پیدا کی ہوئی دُنیا سے ہمارا تعارف کراتا رہا ہے۔ علم و واقفیت کے دروازے ہم پر کھولتا رہا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً الہامی طور پر کسی نہ کسی انسان کو ایسی کوئی بات سُجھاتا رہا ہے جس سے وہ کوئی نئی ایجاد، یا کوئی نیا قانونِ فطرت دریافت کرنے پر قادر ہو سکا ہے۔ لیکن فی الجملہ ہے یہ انسانی علم ہی کا دائرہ جس کے لیے خدا کی طرف سے کسی نبی اور کتاب کے آنے کی حاجت نہیں ہے۔ اس دائرے میں جو معلومات مطلوب ہیں انہیں حاصل کرنے کے ذرائع انسان کو دے دیے گئے ہیں۔

دوسری قسم کی چیزیں وہ ہیں جو ہمارے حواس اور ہمارے فنی آلات کی پہنچ سے بالاتر ہیں۔ جنہیں نہ ہم تول سکتے ہیں، نہ ناپ سکتے ہیں، نہ اپنے ذرائع علم میں سے کوئی ذریعہ استعمال کر کے ان کے متعلق وہ واقفیت ہم پہنچا سکتے ہیں جسے "علم" (KNOWLEDGE) کہا جا سکتا ہو۔ فلسفی اور سائنس داں ان کے بارے میں اگر کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو وہ محض قیاس (SPECNLATION، اور ظن و تخمین (GUESS) ہے جسے علم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ آخری حقیقتیں (ULTIMATE REALITIES) ہیں جن کے متعلق استدلالی نظریات کو خود وہ لوگ بھی یقینی قرار نہیں دے سکتے جنہوں نے اُن نظریات کو پیش کیا ہے۔

اور اگر وہ اپنے علم کے حدود کو جانتے ہوں تو نہ اُن پر خود ایمان لا سکتے ہیں نہ کسی کو ایمان لانے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

یہی وہ دائرہ ہے جس میں انسان حقیقت کو جاننے کے لیے خالقِ کائنات کے دیے ہوئے علم کا محتاج ہے۔ اور خالق نے یہ علم کبھی اس طرح نہیں دیا ہے کہ کوئی کتاب چھاپ کر ایک ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دی ہو، اور اس سے کہا ہو کہ اسے پڑھ کر خود معلوم کر لے کہ کائنات کی اور خود تیری حقیقت کیا ہے، اور اس حقیقت کے لحاظ سے دنیا کی زندگی میں تیرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اِس علم کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے اُس نے ہمیشہ انبیاء کو ذریعہ بنایا ہے، وحی کے ذریعہ سے اُن کو حقائق سے آگاہ کیا ہے اور اُنہیں اِس کام پر مامور کیا ہے کہ یہ علم لوگوں تک پہنچا دیں۔

۶ - نبی کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ بس حقیقت کا علم لوگوں تک پہنچا دے۔ بلکہ اس کا کام یہ بتانا بھی ہے کہ اِس علم کے مطابق خدا اور انسان کے درمیان اور انسان اور انسان کے درمیان کیا تعلق فی الحقیقت (FACTUALLY) ہے اور کیا تعلق عملاً (ACTUALLY) ہونا چاہیے۔ یہ علم کن عقائد کا، کن عبادات کا، کن اخلاقیات کا، اور کن اصولِ تہذیب و تمدن کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اِس علم کی رُو سے معاشرت، معیشت، مالیات (FINANCE)، سیاست، عدالت، صلح و جنگ، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے ہر شعبے کی تشکیل کن اُصولوں پر ہونی چاہیے۔ نبی صرف ایک نظامِ عبادات و رسوم (RITUAL AND WORSHIP) لے کر نہیں آتا جسے دنیا کی اصطلاح میں مذہب (RELIGION) کہا جاتا ہے، بلکہ وہ ایک پورا نظامِ زندگی لے کر آتا ہے جس کا نام اسلام کی اصطلاح میں دین (WAY OF LIFE) ہے۔

۷ - پھر یہ بھی نہیں ہے کہ نبی کا مشن صرف دین کا علم پہنچانے تک ہی محدود ہو۔ بلکہ اس کا مشن یہ بھی ہے کہ جو لوگ اُس کے پیش کردہ دین کو قبول کر کے مسلم بن جائیں انہیں وہ دین سمجھائے، اُس کے عقائد، اخلاقیات، عبادات، قانونی احکام اور مجموعی نظامِ حیات سے ان کو آگاہ کرے، ان کے سامنے خود ایک نمونے کا مسلمان بن کر دکھائے تاکہ وہ اپنی زندگی میں اس کی پیروی کر سکیں، انہیں انفرادی اور اجتماعی تربیت دے کر ایک صحیح اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے عملاً تیار کرے، اور ان کو منظم کر کے ایک ایسی جماعت بنا دے جو دنیا میں خدا کے دین کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد کرے یہاں تک کہ خدا کا کلمہ بلند ہو جائے اور دوسرے کلمے پست ہو کر رہ جائیں۔ ضروری نہیں ہے کہ سب نبی اپنے اِس مشن کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچانے میں کامیاب ہی ہو گئے ہوں۔

بہت سے انبیاء ایسے ہیں جو اپنے کسی قصور کی بنا پر نہیں بلکہ متعصب لوگوں کی مزاحمت اور حالات کی نامساعدت کے باعث اس میں ناکام ہو گئے ۔ لیکن بہرحال تمام انبیاء کا مشن تھا یہی ۔ البتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت تاریخ میں نمایاں ہے کہ انہوں نے خدا کی بادشاہی زمین میں اُسی طرح قائم کر کے دکھا دی جیسی وہ آسمان میں ہے ۔

۸ ۔ قرآن مجید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز ہی سے اپنا خطاب یا تو تمام انسانوں کے لیے عام رکھا ہے ، یا پھر انسانوں میں سے جو بھی اسلام کی دعوت کو قبول کر لیں اُن کو مومن ہونے کی حیثیت سے مخاطب کیا ہے ۔ قرآن مجید کو اوّل سے لے کر آخر تک دیکھ جائیے ، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریروں اور گفتگوؤں کے پورے ریکارڈ کی بھی چھان بین کر لیجیے ۔ آپ کہیں یہ نہ دیکھیں گے کہ اِس کتاب نے اور اس کے لانے والے رسولؐ نے کسی خاص ملک یا قوم یا نسل یا رنگ یا طبقے کے لوگوں کو ، یا کسی خاص زبان کے بولنے والوں کو پکارا ہو ۔ ہر جگہ یا تو یا بنی آدم "اے اولادِ آدم" یا یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ "اے انسانو" کہہ کر پوری نوعِ انسانی کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے ، یا پھر اسلام قبول کرنے والوں کو احکام اور ہدایات دینے کے لیے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا "اے لوگو جو ایمان لائے ہو" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے ۔ اِس سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی دعوت عالمگیر (UNIVERSAL) ہے ، اور جو انسان بھی اس دعوت کو قبول کر لیں وہ بالکل برابر کے حقوق کے ساتھ یکساں حیثیت میں مومن (BELIEVER) ہیں ۔ قرآن کہتا ہے " اہلِ ایمان تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں"[۱] ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو لوگ بھی اسلام کے عقائد قبول کر لیں اور مسلمانوں کا سا طرزِ عمل اختیار کر لیں ، اُن کے حقوق وہی ہیں جو ہمارے حقوق ہیں اور اُن کے واجبات بھی وہی ہیں جو ہمارے واجبات ہیں[۲] ۔ اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، سنو ، تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ (آدم) بھی ایک ۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں ۔ نہ کوئی کالا کسی گورے پر فضیلت رکھتا ہے اور نہ کوئی گورا کسی کالے پر ۔ فضیلت ہے تو خدا ترسی کی بنا پر ہے ۔ تم میں سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک عزت والا وہ ہے جو سب سے بڑھ کر پرہیزگار ہے[۳] ۔

---

۱ الحجرات : ۱۰ ۔ ۲ بخاری ، صلاۃ ، ۲۸ ۔ نسائی ، تحریم ، ۲ ۔

۳ مسند احمد ، جلد ۵ ، ص ۴۱۱ ۔ بیہقی ، کتاب الحج ۔ بخاری و مسلم بمعنیٰ ۔ زاد المعاد لابن القیم ، ج ۴ ، ص ۳۱ ۔

۹ ۔ اسلام کی بنیاد جن عقائد پر ہے اُن میں سب سے مُقدَّم اور سب سے اہم خدائے واحد پر ایمان ہے۔ — صرف اِس بات پر نہیں کہ خدا موجود ہے، اور صرف اِس بات پر بھی نہیں کہ وہ ایک ہے، بلکہ اِس بات پر کہ وہی تنہا اِس کائنات کا خالق، مالک (MASTER)، حاکم (RULER) اور مدبّر (ADMINISTRATOR)[۱] ہے۔ اُسی کے قائم رکھنے سے یہ کائنات قائم ہے، اُسی کے چلانے سے یہ چل رہی ہے، اور اِس کی ہر چیز کو اپنے قیام و بقا کے لیے جس رزق (SUBSISTENCE) یا قوت (ENERGY) کی ضرورت ہے اس کا فراہم کرنے والا وہی ہے[۲]۔ حاکمیت کی تمام صفات (ATTRIBUTES OF SOVEREIGNTY) صرف اُسی میں پائی جاتی ہیں، اور کوئی اُن میں ذرہ برابر بھی اُس کے ساتھ شریک نہیں ہے[۳]۔ خداوندی و اُلوہیت (DIVINITY) کی جملہ صفات کا بھی صرف وہی حامل ہے، اور ان میں سے بھی کوئی صفت اُس کی ذات کے سوا کسی کو حاصل نہیں[۴]۔ پوری کائنات کو اور اس کی ایک ایک چیز کو وہ بیک نظر دیکھ رہا ہے۔ کائنات اور اس کی ہر شے کو وہ براہِ راست جانتا ہے — نہ صرف اس کے حال کو، بلکہ اس کے ماضی اور مستقبل کو بھی۔ یہ نگاہِ ہمہ بیں اور یہ جامع علم غیب اُس کے سوا کسی کو حاصل نہیں[۵]۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے سوا سب فانی ہیں اور اپنی ذات سے خود زندہ و باقی صرف وہی ہے[۶]۔ وہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی

---

[۱] الانعام: ۳، ۷ ۔ الرعد: ۱۶ ۔ طٰہٰ: ۴ تا ۸ ۔ الاعراف: ۵۴ ۔ السجدہ: ۵ ۔ البقرہ: ۱۰۷ ۔ الفرقان: ۲۔

[۲] فاطر: ۳، ۴۱ ۔ الذاریات: ۵۸ ۔ الانعام: ۱۶۴ ۔

[۳] الانعام: ۱۸، ۵۷ ۔ الکہف: ۲۶، ۲۷ ۔ الحدید: ۵ ۔ الحشر: ۲۳ ۔ الملک: ۱ ۔ یٰسٓ: ۸۳ ۔ الفتح: ۱۱ ۔ یونس: ۱۰۷ ۔ الجن: ۲۲ ۔ المومنون: ۸۸ ۔ البروج: ۱۶ ۔ المائدہ: ۱ ۔ الرعد: ۴۱ ۔ الانبیاء: ۲۳ ۔ التین: ۸ ۔ آل عمران: ۲۶، ۸۳، ۱۵۴ ۔ الاعراف: ۱۲۸ ۔

[۴] مریم: ۸۱، ۸۲ ۔ یٰسٓ: ۷۴ ۔ ہود: ۱۰۱ ۔ النحل: ۱۷، ۲۰، ۲۲، ۵۱ ۔ الاحقاف: ۲۷، ۲۸ ۔ یٰسٓ: ۲۲، ۲۳ ۔ یونس: ۱۸ ۔ الزخرف: ۸۴ ۔ فاطر: ۳ ۔ الانعام: ۴۶ ۔ القصص: ۷۰، ۷۲ ۔ سبا: ۲۲، ۲۳ ۔ الزمر: ۶۵ ۔ النمل: ۶۰، ۶۴ ۔ الفرقان: ۳ ۔ النحل: ۳ تا ۵ ۔

[۵] الملک: ۱۳، ۱۴، ۱۹ ۔ الکہف: ۲۶ ۔ قٓ: ۱۶ ۔ الحدید: ۴ ۔ النمل: ۶۵ ۔ سبا: ۲، ۳ ۔ الانعام: ۵۹ ۔

[۶] الحدید: ۳ ۔ القصص: ۸۸ ۔ الرحمٰن: ۲۷ ۔ البقرہ: ۲۵۵ ۔ المومن: ۶۵ ۔

اس کی اولاد - اُس کی ذات کے سوا دنیا میں جو بھی ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور دنیا میں کسی کی بھی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اُس کو کسی معنی میں بھی ربِّ کائنات (LORD OF THE UNIVERSE) کا ہم جنس یا اُس کا بیٹا یا بیٹی کہا جاسکے [۱] وہی انسان کا حقیقی معبود ہے، کسی کو عبادت میں اس کے ساتھ شریک کرنا سب سے بڑا گناہ اور سب سے بڑی بے وفائی (INFIDALITY) ہے - وہی انسان کی دُعائیں سُننے والا ہے اور انہیں قبول کرنے یا نہ کرنے کے اختیارات وہی رکھتا ہے - اُس سے دُعا نہ مانگنا بے جا غرور ہے، اس کے سوا کسی اور سے دُعا مانگنا جہالت ہے، اور اس کے ساتھ دوسروں سے بھی دعا مانگنا خدائی میں غیر خدا کو خدا کے ساتھ شریک ٹھیرانا ہے [۲]۔

۱۰ - اسلام کی رُو سے خدا کی حاکمیت صرف فوق الفطری ہی نہیں بلکہ سیاسی اور قانونی بھی ہے اور اِس حاکمیت میں بھی کوئی اُس کا شریک نہیں - اُس کی زمین پر، اور اُس کے پیدا کیے ہوئے بندوں پر اُس کے سوا کسی کو حکم چلانے کا اختیار نہیں ہے، خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو، یا شاہی خاندان ہو، یا حکمراں طبقہ ہو، یا کوئی ایسی جمہوریت ہو جو حاکمیتِ عوام (SOVEREIGNTY OF THE PEOPLE) کی قائل ہو - اُس کے مقابلے میں جو خود مختار بنتا ہے وہ بھی باغی ہے، اور جو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی اطاعت کرتا ہے وہ بھی باغی - اور ایسا ہی باغی وہ شخص یا ادارہ ہے جو سیاسی و قانونی حاکمیت کو اپنے لیے مخصوص کرکے خدا کے حدودِ اختیار (JURISDICTION) کو شخصی قانون (PERSONAL LAW) یا مذہبی احکام و ہدایات تک محدود کرتا ہے - فی الحقیقت اپنی زمین پر اپنے پیدا کیے ہوئے انسانوں کے لیے شریعت دینے والا (LAW GIVER) اس کے سوا نہ کوئی ہے، نہ ہوسکتا ہے، اور نہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اُس کے اقتدارِ اعلیٰ (SUPREME AUTHORITY) کو چیلنج کرے [۳]۔

---

[۱] الاخلاص: ۳، ۴ - البقرہ: ۱۱۶، ۱۱۷ - الانعام: ۱۰۲ - المومنون: ۹۱ - الکہف: ۴، ۵ - مریم: ۳۵، ۸۸ تا ۹۳ -

[۲] القصص: ۸۸ - الزمر: ۳، ۵، ۶، ۴۴ - الاعراف: ۵۸، ۶۴، ۷۲، ۸۴ - یونس: ۱۸ - لقمٰن: ۱۳ - سبا: ۲۲ - صٓ: ۶۵ - المومن: ۶۰ - النحل: ۳۶ -

[۳] الفرقان: ۴۳ - التوبہ: ۳۱ - الشوریٰ: ۱۰، ۲۱ - المومنون: ۱۱۶ - الناس: ۱، ۲، ۳ - یوسف: ۴۰ - الاعراف: ۳، ۵۴ - المائدہ: ۳۸ تا ۴۰، ۴۵ - البقرہ: ۱۷۸، ۱۸۰ تا ۱۸۲، ۲۲۹، ۲۳۲ - النساء: ۱۱، ۱۲، ۱۷۶ - الجاثیہ: ۱۸ - المائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷، ۵۰ - النحل: ۱۱۶ - النور: ۲ تا ۹ - آل عمران: ۶۴ -

۱۱ - اسلام کے اِس تصورِ خدا کی رُو سے چند باتیں فطری طور پر لازم آتی ہیں : (۱) خدا ہی اکیلا انسان کا حقیقی معبود (یا بالفاظِ دیگر مستحقِ عبادت) ہے جس کے سوا کسی اور کی یہ حیثیت ہی نہیں ہے کہ انسان اُس کی عبادت کرے ، (۲) وہی اکیلا کائنات کی تمام قوتوں پر حاکم ہے اور انسان کی دُعاؤں کا پورا کرنا یا نہ کرنا بالکل اُس کے اختیار میں ہے ، اس لیے انسان کو صرف اسی سے دعا مانگنی چاہیے اور کسی کے متعلق یہ گمان تک نہ کرنا چاہیے کہ اس سے بھی دُعا مانگی جا سکتی ہے ، (۳) وہی اکیلا انسان کی قسمت (DESTINY) کا مالک ہے اور کسی دوسرے میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ انسان کی قسمت بنا سکے یا بگاڑ سکے - اس لیے انسان کی اُمید اور اس کے خوف ، دونوں کا مرجع بھی لازماً وہی ہے - اُس کے سوا نہ کسی سے اُمیدیں وابستہ کرنی چاہییں ، نہ کسی سے ڈرنا چاہیے - (۴) وہی اکیلا انسان اور اس کے گردوپیش کی دُنیا کا خالق و مالک ہے ، اس لیے انسان کی حقیقت اور تمام دنیا کے حقائق کا براہ راست اور کامل علم صرف اسی کو ہے اور ہو سکتا ہے - پس وہی زندگی کی پیچ پیچ (COMPLICATED) راہوں میں انسان کو صحیح ہدایت اور صحیح قانونِ حیات دے سکتا ہے - (۵) پھر چونکہ انسان کا خالق و مالک وہ ہے اور وہی اِس زمین کا مالک ہے جس میں انسان رہتا ہے اس لیے انسانوں پر کسی دوسرے کی حاکمیت یا خود اپنی حاکمیت سراسر کفر (BLASPHEMY) ہے - اور اسی طرح انسان کا خود اپنا قانون ساز (LAW GIVER) بننا ، یا کسی اور شخص یا اشخاص یا اداروں کے اختیارِ قانون سازی کو ماننا بھی یہی نوعیت رکھتا ہے - اپنی زمین پر اپنی مخلوق کا حاکم اور قانون ساز حتماً صرف وہی ہو سکتا ہے ، اور (۶) اقتدارِ اعلیٰ کا حقیقی مالک ہونے کی حیثیت سے اس کا قانون درحقیقت بالاتر قانون (SUPREME LAW) ہے اور انسان کے لیے قانون سازی (LEGISLATION) کا اختیار صرف اُسی حد تک ہے جس حد تک وہ اُس بالاتر قانون کے تحت اور اس سے ماخوذ ہو ، یا اس کی دی ہوئی اجازتوں پر مبنی ہو -

۱۲ - اس مرحلے پر ہمارے سامنے اسلام کا دوسرا اہم ترین بنیادی عقیدہ آتا ہے ، اور وہ ہے عقیدۂ رسالت - رسول وہ شخص ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنا قانون انسان کو دیتا ہے ، اور یہ قانون ہم کو رسول سے دو صورتوں میں ملتا ہے - ایک ، کلام اللہ ، جو لفظ بلفظ رسول پر نازل کیا گیا ہے ، یعنی قرآن مجید - دوسرے وہ اقوال اور اعمال ، اور احکام امر و نہی جو رسول نے اپنے پیروؤں کو خدا کی ہدایت کے تحت دیے ، یعنی سُنّت - اس عقیدے کی اہمیت یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو خدا پر ایمان محض ایک نظری (THEORETICAL)

فکر و خیال بن کر رہ جاتا ہے۔ عملاً جو چیز خدا پرستی کے عقیدے کو ایک تہذیب، ایک تمدن، اور ایک نظام حیات کی شکل میں ڈھالتی ہے وہ رسول کی فکری (IDEOLOGICAL) اور عملی رہنمائی ہے۔ اسی کے ذریعہ سے ہمیں قانون ملتا ہے اور وہی اس قانون کے منشا کے مطابق زندگی کا نظام قائم کرتا ہے۔ اِسی لیے توحید کے بعد رسالت پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص عملاً مسلم نہیں ہو سکتا۔[1]

۱۳ - اسلام میں رسول کی حیثیت اِس طرح واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ ہم ٹھیک ٹھیک یہ بھی جان سکتے ہیں کہ رسول کیا ہے اور یہ بھی کہ وہ کیا نہیں ہے۔

رسول لوگوں کو اپنا نہیں بلکہ اللہ کا بندہ بنانے کے لیے آتا ہے[2]، اور وہ خود بھی اپنے آپ کو اللہ کا بندہ ہی کہتا ہے۔ نماز میں ہر روز کم از کم ۷ مرتبہ جو کلمہ شہادت پڑھنے کی تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دی ہے اس میں یہ فقرہ لازماً پڑھا جاتا ہے کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں[3])۔ قرآن مجید اس معاملہ میں کسی ادنیٰ اشتباہ کی گنجائش بھی نہیں چھوڑتا کہ رسول ایک انسان ہے اور خدائی (DIVINITY) میں اس کا ذرہ برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہے۔[4] وہ نہ فوق البشر ہے، نہ بشری کمزوریوں سے بالاتر ہے، نہ خدا کے خزانوں کا مالک ہے، نہ عالم الغیب ہے کہ اس کو خدا کی طرح سب کچھ معلوم ہو۔[5] وہ دوسروں کے لیے نافع و ضار ہونا تو درکنار خود اپنے لیے بھی کسی نفع و ضرر کا اختیار نہیں رکھتا۔[6] اس کا کام پیغام پہنچا دینا ہے، اس کے اختیار میں کسی کو راہ راست پر لے آنا نہیں ہے، نہ انکار کرنے والوں کا محاسبہ کرنا اور ان پر عذاب نازل کر دینا اس کے اختیار میں ہے۔[7] وہ خود اگر اللہ کی نافرمانی کرے (معاذ اللہ)، یا اپنی طرف سے کوئی چیز گھڑ کر خدا کی طرف

---

۱ النور: ۶۲ - الحجرات: ۱۵ -

۲ آل عمران: ۷۹ -

۳ بخاری، کتاب ۱۰، ابواب ۱۵۳، ۱۵۴ - یہی حدیث مسلم، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، مؤطا، اور مسند احمد میں بھی روایت کی گئی ہے اور یہ متفق علیہ ہے۔

۴ الکہف: ۱۱۱ - حم السجدہ: ۶ - بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳ -

۵ الانعام: ۵۰ - الاعراف: ۱۸۸ -

۶ الانعام: ۱۷ - یونس: ۴۹ -

۷ الانعام: ۵۷، ۵۸ - الرعد: ۴۰ - القصص: ۵۶ - الزمر: ۴۱ - الغاشیہ: ۲۲ -

منسوب کردے، یا خدا کی وحی میں بطورِ خود ذرہ برابر بھی ردّو بدل کرنے کی جسارت کر ڈالے تو وہ خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتا[1]۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں میں سے ایک ہیں، رسالت سے بالاتر کسی حیثیت کے مالک نہیں ہیں[2]۔ وہ اپنے اختیار سے کسی چیز کو حلال اور کسی کو حرام کرنے، یا بالفاظ دیگر خدا کے اذن کے بغیر بطورِ خود قانون ساز بن جانے کے مجاز نہیں ہیں[3]۔ ان کا کام اُس وحی کا اتباع کرنا ہے جو اُن پر خدا کی طرف سے نازل ہو[4]۔

اس طرح اسلام نے اُن تمام مُبالغوں سے نوعِ انسانی کو بچا لیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے انبیاء کے پیروؤں نے اپنے پیشواؤں کے حق میں کیے تھے، حتیٰ کہ ان کو خدا، یا اس کا ہم جنس، یا اس کی اولاد، یا اس کا اوتار (INCARNATION) تک بنا ڈالا تھا۔ اس طرح کے تمام مبالغوں کی نفی کر کے اسلام نے رسول کی جو اصل حیثیت بیان کی ہے وہ یہ ہے۔

رسول پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا[5]۔ جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی اطاعت کرتا ہے کیونکہ اللہ نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے[6]۔ ہدایت وہی پا سکتا ہے جو رسول کی اطاعت کرے[7]۔ رسول جو حکم دے اسے قبول کرنا چاہیے اور جس سے منع کرے اس سے رُک جانا چاہیے[8]۔ (اس امر کی وضاحت خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے کہ میں ایک بشر ہی ہوں۔ جو حکم میں تمہارے دین کے معاملہ میں دوں اس کی پیروی کرو اور جو بات اپنی رائے سے کہوں تو میں بھی ایک بشر ہوں۔ اپنی دُنیا کے معاملات کو تم زیادہ جانتے ہو[9])۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت دراصل قرآن مجید کے منشا کی تشریح ہے، اور یہ تشریح قرآن مجید کے مصنّف، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو خود سکھائی تھی، اس لیے ان کی تشریح اپنے پیچھے خدائی سند (AUTHORITY) رکھتی ہے جس سے ہٹ کر کوئی شخص

---

[1] البقرہ: ۱۲۰، ۱۴۵ - یونس: ۱۵ - الحاقہ: ۴۴ تا ۴۷۔ [2] آل عمران: ۱۴۴ - یٰس: ۳ - الاحقاف: ۹ - النجم: ۵۶۔

[3] التحریم: ۱ - [4] الانعام: ۵۰ - یونس: ۱۵ - الاحقاف: ۹ - [5] النور: ۶۲ - الحجرات: ۱۵ -

[6] آل عمران: ۵۰ - النساء: ۶۴، ۸۰ - الشعراء: ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۲۶، ۱۳۱/ ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۳/ ۱۷۹ -

الزخرف: ۶۳ - نوح: ۳ - [7] النور: ۵۴ - [8] الحشر: ۷ -

[9] مسلم، کتاب ۴۳، حدیث ۱۳۹ تا ۱۴۱ - مُسند احمد، جلد اوّل، ص ۱۶۲ - جلد ثالث ص ۱۵۲ -

قرآن مجید کی کوئی تشریح بطور خود کرنے کا مجاز نہیں ہے[۱]۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی زندگی کو نمونے کی زندگی قرار دیا ہے[۲]۔ کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ رسول کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے[۳]۔ مسلمانوں کا یہ کام نہیں ہے کہ جس معاملے کا فیصلہ خدا اور رسول نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں[۴]۔ بلکہ مسلمانوں کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ کسی پیش آمدہ معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ نہ دیکھ لیں کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم اس معاملے میں کیا ہے[۵]۔

مذکورۂ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کے ذریعہ سے انسان کو صرف ایک بالاتر قانون (SUPREME LAW) ہی نہیں دیا ہے، بلکہ مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) بھی دی ہیں۔ قرآن مجید اور سنت میں جس چیز کو خیر قرار دیا گیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے خیر ہے، جس چیز کو شر کہا گیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے شر ہے، جو چیز فرض کی گئی ہے وہ ہمیشہ کے لیے فرض ہے، جس چیز کو حلال ٹھیرایا گیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے حلال ہے، اور جو چیز حرام کی گئی ہے وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ اس قانون میں کسی قسم کی ترمیم، یا حذف و اضافہ، یا تنسیخ (ABROGATION) کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے، اِلّا یہ کہ کوئی شخص، یا گروہ، یا قوم اسلام ہی کو چھوڑ دینے کا ارادہ رکھتی ہو۔ جب تک مسلمان مسلمان ہیں ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کل کا شر آج خیر ہو جائے، اور پرسوں پھر شر ہو جائے۔ کوئی قیاس، کوئی اجتہاد، کوئی اجماع اس قسم کی تبدیلی کا مجاز نہیں ہے۔

۱۴۔ اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ آخرت ہے، اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اُس کا انکار کرنے والا کافر ہو جاتا ہے اور خدا، رسول، قرآن، کسی چیز کا ماننا بھی اسے کفر سے نہیں بچا سکتا[۶]۔ یہ عقیدہ اپنی تفصیلی صورت میں چھ لازمی تصورات پر مشتمل ہے۔

(۱) دنیا میں انسان غیر ذمہ دار (IRRESPONSIBLE) بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ وہ اپنے خالق کے سامنے جواب دہ ہے۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل انسان کے امتحان اور آزمائش

---

[۱] النحل: ۴۴۔ القیٰمۃ: ۱۷ تا ۱۹۔ [۲] الاحزاب: ۲۱۔ [۳] النساء: ۶۵۔

[۴] الاحزاب: ۳۶۔ [۵] الحجرات: ۱۔ [۶] الانعام: ۳۰، ۳۱۔ یونس: ۴۵۔ الرعد: ۵۔ المومنون: ۳۳۔ الفرقان: ۱۱۔ سبا: ۷، ۸۔ صٓ: ۲۶ تا ۲۸۔ قٓ: ۲ تا ۴۔ التغابن: ۷۔

سکے لیے ہے۔ اس کے خاتمے کے بعد اسے اپنے کارنامۂ حیات کا حساب خدا کو دینا ہوگا۔[۱]

(۲) اس محاسبے کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ نوعِ انسانی کو دنیا میں کام کرنے کے لیے جتنی مہلت دینے کا اللہ تعالیٰ فیصلہ کر چکا ہے اس کے اختتام پر قیامت برپا ہوگی جس میں دنیا کا موجودہ نظام درہم برہم کر دیا جائے گا اور ایک دوسرا نظامِ عالم نئے طرز پر برپا کیا جائے گا۔ اُس نئی دنیا میں وہ تمام انسان دوبارہ زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے۔[۲]

(۳) اُس وقت ان سب کو بیک وقت خداوند عالم کی عدالت میں پیش کیا جائے گا اور ہر شخص کو اپنی ذاتی حیثیت میں اُن اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی جو اس نے خود اپنی ذمہ داری پر دنیا میں کیے ہوں گے۔[۳]

(۴) وہاں اللہ تعالیٰ صرف اپنے ذاتی علم پر فیصلہ نہیں کر دے گا بلکہ عدل کی تمام شرائط پوری کی جائیں گی۔ ہر شخص کے کارنامۂ حیات کا پورا ریکارڈ بے کم و کاست عدالت کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور بے شمار اقسام کی شہادتیں اِس امر کے ثبوت میں پیش کر دی جائیں گی کہ اُس نے خفیہ اور علانیہ کیا کچھ کیا ہے اور کس نیت سے کیا ہے۔[۴]

(۵) اللہ کی عدالت میں کوئی رشوت، کوئی بے جا سفارش اور کوئی خلافِ حق وکالت نہ چل سکے گی۔ کسی کا بوجھ دوسرے پر نہ ڈالا جائے گا۔ کوئی قریب سے قریب عزیز یا دوست یا لیڈر یا مذہبی پیشوا یا خود ساختہ معبود کسی کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ انسان وہاں تو تنہا بالکل بے یار و مددگار کھڑا ہوا اپنا حساب دے رہا ہوگا، اور فیصلہ صرف اللہ کے اختیار میں ہوگا۔[۵]

---

[۱] الکہف: ۷ - الملک: ۲ - القیٰمۃ: ۳۶ - الدہر: ۲ - التکویر: ۸، ۹ - المطففین: ۱ تا ۶ - التکاثر: ۸ -

[۲] الزمر: ۶۸ - الدخان: ۴۰ - الواقعہ: ۴۹، ۵۰ -

[۳] الانعام: ۹۳، ۹۴ - مریم: ۸۱، ۹۶ -

[۴] الکہف: ۴۹ - النور: ۲۴ - یٰسٓ: ۱۲، ۶۵ - الزمر: ۶۹ - حٰمٓ السجدہ: ۲۰، ۲۱ - الزخرف: ۸۰ - الجاثیہ: ۲۸، ۲۹ - قٓ: ۱۷، ۱۸ - القمر: ۵۲، ۵۳ - الانفطار: ۱۰ تا ۱۲ - الطارق: ۹، ۱۰ - الزلزال: ۲ تا ۸ -

[۵] البقرۃ: ۱۶۶، ۱۶۷، ۲۵۴ - یونس: ۲۸ - ابراہیم: ۲۱، ۳۱ - النحل: ۸۶ - مریم: ۸۱، ۸۲ - القصص: ۶۲ تا ۶۸ - فاطر: ۱۸ - المومن: ۱۸ - المعارج: ۱۰ تا ۱۴ - الاحقاف: ۵، ۶ - عبس: ۳۴ تا ۳۷ - الانفطار: ۱۹ -

(۶) فیصلے کا سارا دار و مدار اس بات پر ہوگا کہ انسان نے دنیا میں انبیاء کے بتائے ہوئے حق کو مان کر اور آخرت میں اپنی جواب دہی کو محسوس کر کے ٹھیک ٹھیک اللہ کی بندگی کی یا نہیں۔ پہلی صورت میں اس کے لیے جنت ہے، اور دوسری صورت میں دوزخ۔[۱]

۱۵ - یہ عقیدہ تین اقسام کے انسانوں کی زندگی کے طریقوں کو ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف کر دیتا ہے۔ ایک قسم کے انسان وہ ہیں جو آخرت کے قائل نہیں ہیں اور بس اسی دنیا کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ لامحالہ خیر و شر کا معیار اعمال کے اُن نتائج ہی کو سمجھیں گے جو اِس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہاں جس عمل کا نتیجہ اچھا یا مفید ہو وہ اُن کے نزدیک خیر ہوگا اور جس کا نتیجہ بُرا یا نقصان دہ ہوگا وہی ان کے نزدیک شر ہوگا۔ بلکہ بارہا نتائجِ عمل کے لحاظ سے ایک ہی چیز ایک وقت میں خیر اور دوسرے وقت میں شر ہوگی۔ دوسری قسم کے آدمی وہ ہیں جو آخرت کو تو مانتے ہیں مگر ان کو یہ بھروسہ ہے کہ کسی کی سفارش اللہ کی عدالت میں انہیں بچا لے گی، یا کوئی ان کے گناہوں کا کفارہ پہلے ہی دے چکا ہے، یا وہ اللہ کے چہیتے ہیں اس لیے انہیں بڑے سے بڑے گناہوں کی سزا بھی برائے نام دی جائے گی۔ یہ چیز عقیدۂ آخرت کے تمام اخلاقی فوائد کو ضائع کر کے دوسری قسم کے لوگوں کو بھی پہلی قسم کے اشخاص کی صف میں لے جاتی ہے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو عقیدۂ آخرت کو ٹھیک اُس شکل میں مانتے ہیں جس شکل میں اسلام انہیں پیش کرتا ہے، اور کسی کفارے یا بے جا سفارش یا اللہ سے کسی خاص تعلق کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔[۲] ان کے لیے یہ عقیدہ ایک بہت بڑی اخلاقی طاقت رکھتا ہے۔ جس شخص کے ضمیر میں آخرت کا یقین اپنی صحیح صورت میں جاگزیں ہو جائے اُس کا حال ایسا ہوگا جیسے اس کے ساتھ ہر وقت ایک نگران لگا ہوا ہو جو بُرائی کے ہر ارادے پر اُسے ٹوکتا، ہر اقدام پر اسے روکتا اور ہر عمل پر اسے سرزنش کرتا ہے۔ باہر کوئی گرفت کرنے والی پولیس، کوئی شہادت دینے والا گواہ، کوئی سزا دینے والی عدالت، اور کوئی ملامت کرنے والی رائے عام موجود ہو یا نہ ہو، اس کے اندر ایک سخت گیر محتسب ہر وقت بیٹھا رہے گا جس کی پکڑ کے خوف سے وہ کبھی خلوت میں، یا جنگل میں، یا اندھیرے میں، یا کسی سنسان جگہ میں بھی خدا کے مقرر کردہ فرض سے فرار، اور اس کے مقرر کردہ حرام کے ارتکاب کا حوصلہ نہ کر سکے گا، اور بالفرض اگر کر بھی گزرے تو بعد میں شرمندہ ہوگا اور توبہ کرے گا۔ اس سے بڑھ کر اخلاقی اصلاح، اور انسان کے اندر ایک مستحکم کردار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ خدا کا بالاتر قانون جو مستقل اقدار

[۱] الکہف: ۱۰۵، ۱۰۶ - القصص: ۶۵ - الزمر: ۷۱ - الملک: ۸ تا ۱۱ - النازعات: ۳۷ تا ۴۱ -

[۲] البقرہ: ۸۰، ۸۱، ۱۲۳، ۲۵۵ - آل عمران: ۷۵، ۷۶ - النساء: ۱۰۷ تا ۱۰۹ - المائدہ: ۱۸ - الانعام: ۵۱ - یونس: ۳ - طٰہٰ: ۱۰۹ - النجم: ۲۶ -

انسان کو دیتا ہے اُن پر مضبوطی کے ساتھ انسان کے کاربند ہونے اور ان سے کسی حالت میں اس کے نہ ہٹنے کا انحصار اِسی عقیدے پر ہے۔ اسی لیے اسلام میں اِس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو خدا اور رسالت پر ایمان بھی بے کار ہے۔

۱۶۔ اسلام، جیسا کہ میں پیراگراف ۷ میں بیان کر چکا ہوں، ایک پوری تہذیب، ایک جامع تمدن، اور ایک ہمہ گیر (COMPREHENSIVE) نظامِ حیات ہے، اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں اخلاقی رہنمائی دیتا ہے، اس لیے اس کے اخلاقیات دراصل تارک الدنیا راہبوں اور جوگیوں اور سنیاسیوں کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں کو چلاتے، یا ان کے اندر کام کرتے ہیں۔ اخلاق کی جو بلندیاں دنیا، خانقاہوں، راہبوں اور صومعوں (CONVENTS ، MONASTRIES ، CLOISTERS) میں تلاش کرتی تھی، اسلام ان کو زندگی کے بیچ منجدھار میں لے آنا چاہتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ حکومتوں کے فرمانروا، صوبوں کے گورنر، عدالتوں کے جج، فوج اور پولیس کے افسر، پارلیمنٹوں کے ممبر، مالیات اور صنعت و حرفت کے کارفرما، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ وطلبہ، بچوں کے باپ، باپوں کے بچے، عورتوں کے شوہر اور شوہروں کی عورتیں، ہمسایوں کے ہمسایے، غرض سب ان اخلاقیات سے آراستہ ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر گھر میں بھی اسی اخلاق کی فرمانروائی ہو اور محلے اور بازار میں بھی اسی کا چلن ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ کاروبار کے سارے ادارے اور حکومت کے سارے محکمے اسی کی پیروی کریں۔ سیاست سچائی اور انصاف پر مبنی ہو۔ قومیں حق شناسی اور ادائے حقوق پر ایک دوسرے سے معاملہ کریں۔ جنگ بھی ہو تو شرافت اور تہذیب کے ساتھ ہو نہ کہ بھیڑیوں کی سی درندگی کے ساتھ۔ انسان جب خدا ترسی اختیار کرے، خدا کے قانون کو بالاتر مان لے، خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کو یاد رکھ کر مستقل اقدار کا پابند ہو جائے، تو پھر اس کی یہ صفت صرف عبادت گاہ تک محدود نہیں رہنی چاہیے بلکہ جس حیثیت میں بھی وہ دنیا کے اندر کام کر رہا ہے خدا کے سچے اور وفادار بندے کی طرح ہی کام کرے۔

یہ ہے مختصراً وہ چیز جس کا اسلام علمبردار ہے۔ اور یہ محض کسی فلسفی کی خیالی جنت (UTOPIA) نہیں ہے بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عملاً برپا کر کے دکھا دیا اور آج چودہ سو برس گزر جانے پر بھی اس کے اثرات مسلم معاشرے میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔

جواب تنقید

(۲)

از جناب قدیر الدین صاحب سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ

خطرہ کا انسداد کیا ہے؟ | میرے مقالہ میں جو باتیں نمایاں کی گئی ہیں ان میں ایک بات یہ ضرور ہے کہ ۶۰ کروڑ مسلمانوں کی نمائندہ چالیس مسلمانوں کی حکومتیں رہبری کی منتظر رہ کر مایوس ہو چلی ہیں۔ اور بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جب اُن کو کوئی اس قابل نہ ملا کہ "دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرتا تو اُن کی رہنمائی سے مایوس ہو کر اُمت کے بے چین طبقے اُس نظامِ زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آرہا ہے۔"
وہ سب کے سب فقیہہ اور محدث تو بن نہیں سکتے۔ البتہ کلام پاک پڑھ سکتے ہیں اور اس کے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ کیا صدیقی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہ کریں؟ مگر مشکل یہ ہے کہ ذرا آگے بڑھیں تو ہر طرف اختلافات کی ایک وادئ بے پایاں ہے۔ اُس میں سے گزرنا خود علماء کے لیے جس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ترکی عہدِ عثمانیہ میں جس کمیٹی کے سپرد مجلۂ احکام عدلیہ مرتب کرنے کا کام کیا گیا تھا اُس نے اپنی رپورٹ مورخہ یکم محرم ۱۲۸۶ھ یعنی اب سے سو برس پہلے تحریر کیا ہے کہ:۔

"ظاہر ہے کہ علم فقہ ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے خصوصاً فقہ حنفی میں سے مسائل کی تلاش بہت ہی دشوار ہے۔ کیونکہ بہت سے مجتہدین نے جن کے مدارج متفاوت تھے فقہ میں کام کیا ہے۔ ان میں بہت سے اختلاف ہیں اور مزید برآں اُن میں فقہ شافعی کی طرح کوئی عمل تنقیح نہیں ہوا ہے بلکہ آج تک مختلف اقوال و فتاوے بکھرے ہوئے اور اُلجھے ہوئے پڑے ہیں۔ ان مختلف اقوال و مسائل میں سے صحیح قول تلاش کرنا اور پیش آمدہ صورتِ حال پر اس کی تطبیق بے انتہا مشکل کام ہے۔ اس پر مزید مشکل یہ ہے کہ جن مسائل کی بنیاد عادات و رواج پر قائم ہوتی ہے۔ وہ امتداد ایام کے سامنے بدلتے رہتے ہیں۔"

کتنے فقیہہ ایسے ہوتے ہیں جو مسائل فقہ پر ہر حیثیت سے ماہرانہ نظر رکھتے ہوں۔ اس کے متعلق آگے چل کر رپورٹ میں تحریر ہے کہ:

" اور آج کل (یعنی اب سے سو برس پہلے، تو (دولت عثمانیہ میں) ایسے عالم ہی بہت نادر ہیں جو مسائل فقہ پر ہر حیثیت سے ماہرانہ نظر رکھتے ہوں "۔

فقہ اور اس کے ماہرین کی یہ کیفیت ہونے کے باوجود مجلۂ احکام عدلیہ تیار کیا گیا جس کا تعلق کل فقہی مسائل کے ایک تھوڑے سے جزو سے ہے۔ مگر کچھ عرصہ بعد اُس مجلہ کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اب وہ کسی اسلامی مملکت میں نافذ نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ صدیقی صاحب فرمائیں گے کہ سب اہلِ اقتدار اپنے ایمان کی خبر لیں۔ مگر اُن کے لیے رَاہبر بھی کوئی ہے؟ ایک طرف کلام پاک سے استفادہ کرنے میں بقول صدیقی صاحب خطرہ ہے۔ دوسری طرف فقہائے اُمت جماعتوں میں منقسم ہیں۔ اور لعن طعن میں مشغول ہیں۔ اس وقت یعنی بیسویں صدی میں جو کیفیت ہے، اس کا ایک خاکہ تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اُس تقریر میں پیش کیا ہے جس کو اُوپر نقل کیا گیا ہے۔ مولانا صاحب کی تقریر مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک کے نقطۂ نظر سے گھبراہٹ کیوں ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

" ہماری عربی درسگاہوں میں بھی ایک مدّت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آ رہا ہے کہ تعلیم کی ابتدا فقہ سے کی جاتی ہے۔ پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں۔ اور قرآن کی صرف ایک یا دو سورتیں محض تبرکاً داخل درس کر دی جاتی ہیں۔ بلکہ ان میں کلام الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو فضلاء ان درسگاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی رُوح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں...... وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذہب خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں "۔

اگر دین اور اس کے مجموعی نظام سے یہی نابلدی ہو تو تعجب نہیں کہ قرآن کریم کا ابدی، آفاقی اور سرمدی پیغام ایک سازش نظر آنے لگے۔ معلوم نہیں کہ سازش کلام پاک کے اصولوں اور جوہری تصورات کا بیان ہے یا وہ ذہنیت ہے جس کے عیوب دُور کرنے کے لیے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تجاویز پیش کرنے کے بعد مذکورہ بالا تقریر میں فرمایا کہ جب تک اُن پر عمل نہ ہو تو:

" نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ ان کے اندر (جو اس طرح مطالعہ کرتے ہیں) وہ اجتہادی

صلاحیتیں اُبھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں - اور نہ ان کے اندر ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں - جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روز افزوں ضروریات کے لیے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں ۔"

جب یہ مشکلات ہیں تو اِن کا حل یہ تو نہیں ہے کہ " خالص قرآنی نقطۂ منظر " کو خطرناک اور سازشی ٹھہرایا جائے۔ صدیقی صاحب مانیں یا نہ مانیں میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ اور اس کا کلام سب سے پہلے ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اللہ اور کلام اللہ کے متبع تھے ۔ چنانچہ حل یہ ہے کہ کلام پاک کو سنّتِ رسول اللہ سے سمجھا جائے اور سُنّتِ رسول اللہ کو قرآن پاک کے نقطۂ نظر سے سمجھا جائے ۔ تاکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ربط کلامِ پاک سے صاف سمجھ میں آ جائے اور کلام اللہ کا ابدی، آفاقی اور سرمدی پیغام روز روشن کی طرح اس میں چمکتا نظر آنے لگے - اور اس طرح سنتِ رسول اللہ اس کا عملی پیکر دکھائی دینے لگے ۔ اس کے بجائے اس پر اصرار درست نہیں کہ خالص قرآنی نقطۂ نظر کو سازش بنا دیا جائے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

قرآن کو آنکھوں سے لگانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا - میں بقولِ اقبال اس کا بھی قائل ہوں کہ :-

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

مگر اس میں اور پہلے شعر میں تضاد نہیں ہے ۔ دوسرے شعر کی بنیاد اور اساس کلام پاک ہی پر ہے ۔ محمد تو بہت ہوئے اور ہوں گے ۔ مگر ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو وہی ہے جو کلام اللہ کے ارشاد کے مطابق اللہ کا رسول ہے ۔ میرے نزدیک خطرہ اس میں ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے ۔ اگر صدیقی صاحب مجھ سے اس میں متفق نہیں تو میں یہ نہیں کہتا کہ نیت میں فتور ہے بلکہ قصور ہمارے دائرۂ علم اور ہماری وسعتِ عقل کا ہے ۔ جس کو ہم آپس میں طے نہیں کر سکتے ۔ یہ فرق گرما گرمی سے نہیں نکل سکتا اور نہ لفظی موشگافیوں سے یہ اختلاف اگر اس دنیا میں دُور ہو سکتا ہے تو کسی مومن کی ایسی نگاہ سے جس سے بقول اقبال " بدل جاتی ہیں تقدیریں " ۔ سازش اور بدنیتی کے الزام دلوں میں گرہ ڈال سکتے ہیں - دلوں کو صاف نہیں کر سکتے ۔

اُمت مسلمہ کا مسئلہ ارتقاء ہے وقتی چھاپ کی بحث نہیں ہے

اُوپر ذکر ہو چکا ہے کہ صدیقی صاحب نے منکرینِ حدیث کے اس نظریے کی کہ سُنّتِ رسول اللہ پر وقتی چھاپ تھی سختی سے مخالفت کی ہے مجھے اُس کی

شکایت نہیں۔ میں پھر عرض کر دوں کہ میں سُنّتِ رسول اللہؐ کو پوری پوری طرح دین کا ماخذ مانتا ہوں۔ البتہ صدیقی صاحب کے طعن و تشنیع کے باوجود یہ سمجھتا ہوں کہ جس قول، فعل یا تقریر کو سُنّت رسول اکرمؐ بتایا جائے وہ آنحضرتؐ کی سُنّت ثابت ہو اور اس کو سمجھ کر اس کا اتباع کیا جائے۔ اس سے غالباً صدیقی صاحب بھی انکار نہیں کریں گے۔
رہی وقت کی چھاپ کی بحث تو اس کی بنیاد دراصل اُنہی بے چین طبقوں کی بے چینی ہے جن کے متعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ وہ رہبری سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور دنیائے اسلام کی ارتقاء کی تمنا کرتے ہیں۔ یہی ہے وہ ذہنیت جو منکرینِ سنّت کی محرک ہے۔ اگر ارتقائے ملّت کی رہبری مہیا ہو جائے اور مذہبی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کر دی جائے۔ تو منکرینِ سنّت بھی خاموش ہو جائیں گے۔ ان میں بھی نیک نیت ہیں اور رسول اکرمؐ کی محبت سے سرشار ہیں۔ لیکن اگر ارتقاء کی عملی راہ بتانے کی بجائے بدنیت اور بے ایمان کہا جائے تو اُن کا یقین اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے کہ مسیحائی کے دعویداروں کے پاس کوئی نسخۂ حیات نہیں۔ اگر اُن سے یہ کہا جائے کہ درحقیقت تمہارا کوئی خاص مسئلہ ہی نہیں یہ تو ساری بناوٹی چیخ پکار ہے تو وہ معالجوں کو بے خبر اور نادان بھی سمجھنے لگتے ہیں اور معالجوں پر سے بھروسہ اُٹھ جاتا ہے۔
اس لیے صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ وقتی چھاپ کی بحث کو چھوڑ کر اُمت کے ارتقاء کے مسئلہ پر توجہ کی جائے۔ جو بات تسلیم کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ساری اُمت کا مسئلہ ارتقاء کا مسئلہ ہے۔ اور ہمیشہ سے رہا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کی تقریر میں فرمایا کہ:-

"روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقاء اوّل روز ہی سے شروع ہو گیا تھا"

مزید فرمایا کہ:-

"پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا ارتقاء ہوتا ہے۔ انہیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحبِ علم آدمی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ جس طرح پچھلی بارہ صدیوں میں یہ قانون ہر دور اور ہر ایک ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے"۔

یہ بات کھل کر سامنے آجانے کے بعد وسعتِ نظر کوئی خطرناک چیز نہیں رہتی نہ اس میں کوئی سازش ہے۔ بلکہ اس دور کی ضروریات کے مطابق ارتقاء ہو سکتا ہے۔ اور ہونا چاہیے۔ جو بات باقی رہتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتقاء کی صحیح اور علمی راہیں بتائی جائیں تاکہ اس دور کی ضروریات کے مطابق ارتقاء ہو جائے۔ فقط اس سے

تو کام نہیں چلتا کہ یہ بھی نہ کرو، وہ بھی نہ کرو۔ یہ بھی تو بتائیے کہ جو معاملات درپیش ہیں ان کو کس طرح حل کیا جائے؟ اور وہ ایسا حل ہو جو سمجھ میں آجائے اور اطمینان بخش ہو۔ اگر سمجھ میں آجائے اور اطمینان بخش ہو تو میری عرض پھر یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی حکومتیں دلوانی تو نہیں کہ خواہ مخواہ ان کی طرف سے منہ موڑ لیں۔ وہ اچھے مسلمان نہ سہی۔ مگر ان کا بگڑتا کیا ہے کہ کام بھی چل جائے اور کروڑوں مسلمان خوش اور مطمئن بھی ہو جائیں؟

مگر اُن پر پھبتیاں الگ اُڑائی جاتی ہیں اور یہ بات خود معرضِ بحث میں پڑ جائے کہ دَورِ حاضر کی کوئی ضروریات ہیں بھی یا نہیں۔ اگر ہیں تو کیا ہیں؟ اور ان کو کون بتا سکتا ہے؟

تو یہ مسئلہ اقتدار کی کشمکش میں پڑ جاتا ہے۔ اور بجائے دینی ہونے کے سیاسی بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ دین کو سیاست بنانے کا ہے۔ اور پھر اس پر غصہ کرنا کہ ہم ایمان والے ہیں اور تم اپنے ایمان کی خبر لو دین کی عظمت میں خلل پذیر ہوتا ہے۔ اگر کوئی سیاسی اکھاڑے میں آئے اور یہ کہے کہ میری مان جاؤ میں سب کچھ کر کے دکھا دوں گا تو یہ دعوٰی نہ سیاست میں رہتا ہے اور نہ دین میں۔ اس وقت یہ سوال ضرور اُٹھے گا کہ پہلے ہمیں بتا دیجیے کہ آپ کے پاس کیا حل ہے۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ پہلے تم اپنے ایمان کی خبر لو تو فریق مخالف بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ بھی ایک سیاسی پارٹی بن کر آئے ہیں۔ آپ کی نیت ثابت سہی کم از کم اپنا حل تو پیش کیجیے اور ہم کو اطمینان دلائیے۔

ہر دینی رہبر یہ تو اُمید نہیں کر سکتا کہ اُس پر بھروسہ اس طرح کیا جائے کہ گویا وہ رسولِ خدا کا جانشین ہے۔ اور رسالت کی ساری حکمت اس میں حلول کر آئی ہے۔ جو کچھ اعتبار کیا جانا چاہیے وہ بھی پارٹیوں، فرقہ بندیوں اور جماعتوں کی فراوانی سے معرضِ بحث میں پڑ جاتا ہے۔

بات وہیں آکر رُک جاتی ہے کہ پہلے ارتقاء کی ضرورت کو تسلیم کیجیے۔ اور اس کا حل پیش کیجیے۔ بات چند لفظوں میں یہ ہے کہ پہلے بھروسہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

اسلام کی کامیابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بھروسہ سے ہوئی۔ اور ان کی پے در پے کامیابیاں اُس بھروسہ کو ہر روز بڑھاتی رہیں۔

مجھ سے ایک براہ راست استفسار

پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔ بہر حال اُنہوں نے مجھ سے ایک بات دریافت کی ہے۔ یہ ان کی طرف سے میری عزت افزائی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

یوں تو پروفیسر صاحب کے سارے "اشارات" جواب طلب ہیں ان کا جواب دینے کے لیے دفتر چاہیے اور ایک عمر بھی۔

میں نے حکیم محمد سعید صاحب کی فرمائش سے اچھا کام سمجھ کر مقالہ لکھا۔ اب پروفیسر صاحب کی فرمائش تو ترجمان القرآن کی مئی ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں چھپ گئی ہے۔ ان کے آخری سوال کے متعلق جو کچھ سمجھ سکتا ہوں عرض کیے دیتا ہوں۔ اگر پروفیسر صاحب اتفاق نہ کریں تو خفا نہ ہوں کیونکہ میں عمر بھر ایک طالب علم رہا ہوں۔ پروفیسر نہیں ہوں۔

پروفیسر صاحب نے سوال اس طرح کیا ہے کہ:۔

"جسٹس صاحب اس ملک میں علمی اعتبار سے ایک نامور ہستی ہیں۔ اور وہ قانونی اصطلاحات اور ان کے مضمرات سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم ان سے یہ دریافت کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ کیا تفویض کردہ محدود حاکمیت اور اصل حاکمیت ایک دوسرے کے مدمقابل موقف ہیں؟ کیا حاکم اعلیٰ کی نیابت کے معنی اس کی حاکمیت میں بے جا مداخلت اور شرکت ہیں؟ دنیا میں تو آج تک نیابت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا رہا ہے کہ جو فرد گروہ یا ادارہ نیابت کا منصب قبول کرتا ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اصل حاکم کا نائب اور خلیفہ ہے۔ جیسے اس کے عطا کردہ دائرہ اختیار میں حاکم حقیقی کے منشا کو ہی پورا کرنا ہے۔ یہ راز ہم پر آج جسٹس صاحب کی نکتہ آفرینی سے کھلا ہے کہ نیابت اصل حاکم کے خلاف بغاوت اور سازش کا منصب ہے"

یہ سوال اس ارشاد گرامی کے بعد اُٹھایا گیا ہے کہ:۔

"جسٹس صاحب کا یہ خیال بھی نرالا ہے کہ اگر مسلمان اپنے احاطہ اقتدار میں خدا کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے ان اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں جو کائنات کے فرمانروائے حقیقی کی طرف سے اُن پر عائد ہوتی ہیں تو وہ شرک جیسے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور کائنات پر اپنی حاکمیت غیر مرئی قوانین کے ذریعہ مسلط کر رکھی ہے۔ اب اگر مسلمان اس حاکمیت کو مرئی ضابطوں کی مدد سے کسی معاشرے پر قائم کریں تو یہ حاکمیت الٰہی میں شرکت کے مترادف ہے۔ اور اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ سنگین جرم کا تصور نہیں کیا جا سکتا"

پروفیسر صاحب نے مذکورہ بالا عبارت بغیر کسی حوالے کے تحریر کی ہے۔ نہ میرے مقالہ کا صفحہ درج کیا اور نہ میری عبارت پیش کی۔ اس لیے میں خوشی سے اس "نرالے تصور" اور اس "نقطہ آفرینی" کے سہرے کو اپنے سر سے اُتار کر انہی کے سر سے باندھے دیتا ہوں۔ وہی اس کے حقدار ہیں کیونکہ یہ عبارت میری قطعی نہیں ہے۔ میں اس سے

مُبرا ہوں۔

اب میں کیا جواب دوں ؟ اگر خود تلاش کروں کہ یہ " نرالا تصور" اور یہ " نقطۂ آفرینی" کہاں سے پیدا ہوئی تو مجھے کیا معلوم کہ میں کچھ سوچوں اور پروفیسر صاحب اس کے علاوہ کسی اور طرف " اشارات" کا رُخ کر دیں۔ بس یہ بیان کر سکتا ہوں کہ تفویض اور نیابت کا میرے نزدیک مختصراً کیا تصور ہے۔ تفصیل میں تو مستقل کتب موجود ہیں۔ اجمالاً عرض ہے کہ اوّل تو تفویض اور نیابت کملاً ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ تفویض میں سپردگی پائی جاتی ہے اور نیابت میں قائم مقامی۔ دوسرے یہ کہ دونوں الفاظ میں سے کسی میں بھی یہ معنی نہیں پائے جاتے کہ جس نے اپنا نائب یا قائم مقام بنا دیا وہ خود دست بردار ہو گیا۔ چنانچہ تیسری بات یہ پائی جاتی ہے کہ تفویض اور نیابت دونوں میں سے کسی کے ذریعے سو فیصدی اختیارات نہیں بلکہ محدود اختیارات منتقل ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی وسیع ہوں۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ قائم مقام یا نائب اگر ان حدود سے تجاوز کرے جو مقرر کر دی گئی ہیں تو وہ خلاف ورزی کرتا ہے۔ معاشی و معاشرتی تعلقات اور سیاست مدنیہ میں تو نائبوں اور قائم مقاموں کی خلاف ورزیاں مشہور ہیں۔ جب کوئی شخص اُس دائرۂ اختیار سے بڑھ جائے جو اللہ کی طرف سے کھینچا گیا ہے تو وہ اللہ کی منشا کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زیادہ سے زیادہ چھ خلاف ورزیوں کی سزا دُنیا میں مقرر کی ہے اور ان کی بازپُرس آخرت میں بھی ہے۔ مثلاً چوری اور رہزنی۔ خدا کی منشا کی باقی ساری خلاف ورزیوں کی بازپُرس آخرت میں ہے۔ نیز کوئی خلاف ورزی ایسی نہیں ہے جس کی سزا اللہ کی طرف سے دنیا میں مقرر کی گئی ہو۔ مگر اس کی بازپُرس آخرت میں نہ ہو۔ یہ کوئی نہیں کہتا اور نہ درست طور پر کہہ سکتا ہے کہ دنیا کی بازپُرس اور آخرت کی بازپُرس ایک ہی چیز ہے۔ اگر سہولت کے لیے ملکی قانون کی اصطلاح استعمال کی جائے تو کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں اختیاراتِ سماعت علیحدہ ہیں۔ دُنیا کا اختیار صرف جسم پر چلتا ہے۔ اِس کے معنی یہ نہیں کہ دوئی ہے۔ بلکہ ایک ہی انتظام اعلیٰ کے دو پہلو ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب " ہمات " میں فرماتے ہیں :-

> " دین محمدی کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ جہاں تک دین کی ظاہری حیثیت کا تعلق ہے اُس کا مقصود مصلحتِ عامہ کی نگہداشت اور اس کی دیکھ بھال ہے۔"

چنانچہ ظاہر ہے کہ اللہ کے دنیا اور آخرت کے ہمہ گیر اختیارات اور فقط دنیا کے انتظام و انصرام کا اختیار ایک چیز نہیں۔ نیز اللہ جب کسی کو دنیا میں حکومت دیتا ہے تو وہ حاکم اللہ کا محکوم ہوتا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھے

کہ وہ اللہ کا سہیم و شریک بن گیا۔ اللہ کی حکومت میں کوئی شریک وسہیم نہیں ہے (بقرہ ۲۵۵ : ۲)۔ اگر دنیاوی حاکم ایسا سمجھے تو وہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ مثلاً اللہ نے اسلام نہ لانے کی کوئی دُنیاوی سزا مقرر نہیں کی ہے۔ اگر کوئی حاکم غیر مسلموں کو محض اس وجہ سے قتل کرنے لگے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اور اس قتل سے کسی دُنیاوی جرم اور اس ضمن میں کسی دنیاوی قانون کا تعلق نہ ہو تو وہ اپنے دائرۂ اختیار سے تجاوز کرے گا اور اُس کا جواب دہ ہوگا۔ رہی اس حاکم کی بات جو اپنے حدود میں رہتا ہے تو اس پر خلاف ورزی کا سرے سے الزام ہی نہیں۔ اگر الزام ہو تو جیسی اس کی نوعیت ہوگی ویسا اس کا نتیجہ نکالا جائے گا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر ایک مجتہد، مجتہد مطلق ہو۔ مگر میں نے تو کسی قسم کا مجتہد ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کیا۔ البتہ اسلامی، ملکی اور مغربی قانون کے مطالعہ میں میری عمر کے چالیس سے زیادہ سال بسر ہوگئے ہیں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ وہ پروفیسر صاحب کی فرمائش سے ہے۔ اُنھوں نے ہی مجھے اس قابل تصور فرما کر عنایت فرمائی ہے۔

میرے مقالہ کا لُبِّ لباب پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون کے دوران میں ایک آدھ دفعہ مجھ سے اتفاق کیا ہے۔ مئی کے پرچے میں صفحہ ۱۰۶ پر فرمایا ہے کہ :۔

> "جسٹس صاحب کے پورے مقالہ کا لُب لباب یہ ہے کہ قرآن مجید اسلامی ریاست کے قیام کا قطعاً داعی نہیں۔ اجتماعی معاملات میں اُس کا مقصد یہ ہے کہ اس کرۂ ارض کو پختہ سیرت و کردار رکھنے والے افراد سے معمور کردے۔ جسٹس صاحب نے جو بات ارشاد فرمائی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ اتفاق کیا کم ہے کہ سارے مقالہ کے لُب لباب کو چند الفاظ میں خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے اور پھر اُس سے اتفاق کر لیا۔ اب بچا کیا؟ مگر اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :۔

> " لیکن فاضل مقالہ نگار کے موقف اور طرزِ استدلال کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے تحت الشعور میں دین اور سیاست کی دُوئی کا وہی تصوّر کار فرما ہے جو اہلِ یورپ کے دماغ پر مستولی ہے۔"

پروفیسر صاحب یہ بھی کر سکتے تھے کہ میرے مقالہ کا جو لُب لباب ہے اس کی تائید مجھ سے زیادہ اچھے طریقہ پر کرتے۔ اس کے لیے بہتر سے بہتر دلائل پیش کرتے۔ مگر انھوں نے یہ طرز اختیار نہیں کیا بلکہ میری ذات اور میری دماغی کیفیت پر متوجہ ہوگئے۔ اور جو جو قلم سے نکلا لکھتے چلے گئے۔ رسول اکرمؐ کے ارشاد کی وہ روایت تو

ان کی نظر میں ہوگی جس کو مولانا حالی نے ان الفاظ میں منظوم کیا ہے کہ:۔

حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو

جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

میرا مطلب یہ نہیں کہ میں نے کوئی حکمت کی بات کہی۔ مطلب یہ ہے کہ گر کوئی صحیح بات میرے منہ سے نکل گئی تو میرے منہ کی طرف کیوں دیکھتے ہیں؟ بات کو سُنتے۔ مگر پروفیسر صاحب کو میرے تحت الشعور تک پہنچ کر بات ہی کو بگاڑنا منظور ہوا۔ میرے دل کے راز داں بن کر مجھ سے بدظنی اس بنا پر کی کہ طرزِ استدلال ناپسند ہوا۔ مگر بدظنی کی بھی حد ہوتی ہے۔ کبھی روایات سُن کر ہو گئی تو کبھی مقالہ کی اعلیٰ طباعت دیکھ کر۔

ان کے اور میرے طرزِ استدلال میں تو فرق ہونا لازمی ہے۔ اگر طرز کی وجہ سے بدظنی کرنا جائز ہوتا تو مجھے بھی ان سے اور ان کی نیّت سے بدظنی کرنے کا حق ہو گیا ہوتا۔ مگر میں تو یہ نہیں سمجھتا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں تو اسلام کی وحدت کا قائل ہوں۔ اور جن سے مجھے واسطہ پڑتا ہے وہ میرے اس اصرار کے شاکی ہیں۔ مگر پروفیسر صاحب نے میرے تحت الشعور میں دُوئی بھانپ لی اور وہ بھی وہ دُوئی جو اہلِ یورپ کے دماغ پر مستولی ہے۔ اب میں اُن سے کیا کہہ سکتا ہوں؟ بس دُعا یہ ہے کہ:۔

ع دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

پروفیسر صاحب سے ایک استدعا

پروفیسر صاحب نے میرے مقالہ کا لب لباب صحیح اخذ فرمایا جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے ایک ضرورت یہ ہے کہ جو اہلِ اقتدار ہیں ان کو اطمینان دلایا جائے کہ اسلام کے ذریعہ ارتقاء ہو سکتا ہے تاکہ وہ دین کو دُور از کار چیز نہ سمجھیں۔ یہ یقین عملی صورت پیدا کر کے دلانا دین کی شان کے خلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عملی طریقہ سے یہ یقین دلایا اور ایمان پختہ کیا۔ یہ کام بہت ضروری ہے اس کو نہ فقط مغرب زدہ مسلمان کر سکتے ہیں اور نہ مشرق زدہ۔ اوّل الذکر اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ ان میں روحانیت کی کشش ہی نہیں ہے جو دلوں پر اثر کرنے کے لیے علم سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر وہ کوشش کرتے ہیں تو آخر الذکر طبقہ میں بدظنی بھی پھیلتی ہے۔ اور اس بات کا بھی ڈر پیدا ہوتا ہے کہ کہیں تسلسلِ ارتقاء کی بجائے درمیان میں ایک خلاء پیدا نہ ہو جائے۔ آخر الذکر اصحاب اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ وہ جدید ضروریات اور علومِ جدید سے کماحقہ واقف نہیں۔ صدیوں سے ان کو سیاستِ مدنیہ کا تجربہ نہیں ہے۔ نیز جیسا کہ پروفیسر صاحب کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ وہ اصحاب وسعتِ نظری کو کم از کم شدید بد احتیاطی ضرور تصور فرماتے

ہیں۔ اس لیے میں نے اپنے مقالہ کے آخری پیرے گراف میں عرض کیا تھا کہ قدیم اور جدید خیالات کے لوگوں کو مل کر اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اگر یہ لوگ مل کر اس کام کو ہاتھ میں لے لیں تو بھی یہ کام آسان تو نہیں مگر پورا ہو سکتا ہے۔ سب تو اس کام میں شامل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ یہ کام ذاتی فائدہ کا تو ہے نہیں۔ اگر تھوڑے سے بھی آپس میں اتحاد، عمل اور جستجو کریں اور تھوڑا کام بھی ہو جائے تو کم از کم آپس کا ٹکراؤ تو کم ہوگا۔ اور راستہ تو کھلے گا۔

پروفیسر صاحب نے فروری کے پرچہ میں صفحہ ۲۴ پر قرآن اور حدیث کے حوالہ سے اس بات پر زور دیا ہے کہ:۔

"اگر کوئی اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے تو سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔"

یہ درست ہے مگر بلانے کا طریقہ بھی تو اللہ نے بتایا ہے۔ اور میں نے کلام پاک کی ایک متعلقہ آیت کریمہ اس مضمون کے عنوان کے طور پر لکھی ہے۔ میں اپنی طرف سے اسے لبیک کہتا ہوں۔ اب پروفیسر صاحب اپنے دل میں فیصلہ کر لیں کہ مجھ ناچیز کی خواہش طرز کے اختلاف کے باوجود قابل لحاظ ہے یا نہیں؟ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میرے طرز میں بھی فرق ہے اس لیے اگر وہ مجھ سے تعاون نہ کریں تو کم از کم یہ تو سوچیں کہ نیت پر حملے کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ نیز کیا ساری دنیا کی حکومتوں کے اہل اقتدار کے ایمان پر حملہ کرنا ایسا ہی بلانا ہے کہ وہ سر تسلیم خم کر لیں؟

کسی غیر معصوم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ خدائے جل شانہ نے خود اپنے محبوب خاص سے

چراغ افروزِ چشم اہلِ بینش
طرازِ کار گاہِ آفرینش

اور فخر انبیاء سے فرما دیا کہ:۔

"اگر تم کہیں تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب (لوگ) تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

(آل عمران ۱۵۹)

مطبوعات

آسان درسِ عربی

مؤلف :۔ جناب محمد یار راضی صاحب

ناشر :۔ محمد یار راضی ۔ محمدی سٹریٹ نیو سمن آباد لاہور

صفحات :۔ ۱۲۸ قیمت :۔ ۴/ روپے

"آسان درسِ عربی" تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سادہ اور عام فہم انداز میں عربی سکھانے کے لیے تحریر کی گئی ہے ۔ یہ کتاب پچیس آسان اسباق پر مشتمل ہے ۔ فاضل مؤلف نے ابتداء ان عربی الفاظ سے کی ہے جو اُردو زبان میں بھی روزانہ استعمال ہوتے ہیں تاکہ عربی زبان کے متعلق ذہنوں میں مغائرت کا احساس پیدا نہ ہو۔ عربی گرامر کے پیچیدہ قواعد اور اس کی بھاری بھر کم اصطلاحات سے بچتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں ضروری قواعد کو پیش کیا گیا ہے ۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اکثر الفاظ ، جملے اور اقتباسات قرآن مجید سے لیے گئے ہیں اور اس طرح قرآنِ حکیم سے ایک گونہ ذہنی لگاؤ پیدا ہوتا ہے ۔ ہم ثانوی جماعتوں کے طلبہ کے لیے بالخصوص اور عربی سیکھنے کے خواہشمند حضرات کے لیے بالعموم اس کتاب کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں ۔

غیر فانی تہذیب

مصنف :۔ پروفیسر سعید اختر صاحب

ناشر :۔ قاضی سنز ، پبلشرز اینڈ بک سیلرز ۔ جان محمد روڈ انار کلی لاہور

کاغذ نیوز پرنٹ ۔ صفحات :۔ ۲۲۴ قیمت :۔ ۱۵/ روپے

زیر تبصرہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں اسلامی تہذیب کو تشکیل دینے والی چند بنیادی صفات کا ذکر ہے ۔ مثلاً تقویٰ ، ذکر ، تدبر ، تحمل ، عفو و درگذر ، صبر ، شکر ، عدل اور عفو و احسان ۔ اسی حصے میں اسلامی نظامِ تعلیم کے خدوخال کا مختصر خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے ۔ فاضل مصنف نے (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) لیے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ چونکہ چالاک اور عیار لوگوں نے مذہب کے نام پر انسانیت کو خوب لوٹا ہے اس لیے نوعِ بشری کی فلاح و بہبود کی خاطر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے۔ ان لوگوں کے دل و دماغ پر جب مذہب کے خلاف نفرت کا جنون سوار ہو جاتا ہے تو وہ اس سادہ سی حقیقت کو بھی سمجھ نہیں پاتے کہ اس میں مذہب کا تو کوئی قصور نہیں بلکہ قصور ان دھوکہ بازوں کا ہے جو دین کی محبت کے دعویدار بن کر عوام کو فریب دیتے ہیں یا قصور ان کے اپنے فہم و ادراک کا ہے کہ وہ دین کے معاملے میں اس قدر غافل اور کوتاہ نظر ہیں کہ ان کے اندر یہ جاننے کی خواہش اور صلاحیت نہیں ہوتی کہ جو شخص اللہ کے دین کا خادم بن کر اُن کے سامنے آرہا ہے اُس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ اندازہ کریں کہ وہ اپنے دعوؤں میں کہاں تک سچا اور مخلص ہے۔

(بقیہ مطبوعات)

نہایت سادہ اور عام فہم لیکن دلنشیں پیرایہ میں اسلامی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ہر عنوان کے تحت قرآن مجید کی آیات، احادیثِ نبوی، آثارِ صحابہؓ اور علمائے قدیم و جدید کے افکار کو بڑی عرق ریزی سے جمع کر دیا ہے۔ اس سے فاضل مؤلف کی وسعتِ مطالعہ اور حُسنِ انتخاب کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصّہ "آئینہ سیرت" میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ پر قلم اُٹھایا گیا ہے اور کتاب کے تیسرے حصّہ "آئینہ خلافت" میں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم کے حالاتِ زندگی اور ان کی دینی و ملی خدمات کا تذکرہ ہے۔

فاضل مؤلف نے یہ کتاب انٹرمیڈیٹ اسلامیات کے جدید نصاب کو پیش نظر رکھ کر تالیف کی ہے۔ لہٰذا طلباء کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ طلباء کے علاوہ عام دینی ذوق رکھنے والے لوگ بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اس میں مصنف نے قرآن حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ وہ لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

جو حضرات پیشگی روپیہ روانہ کر دیں گے انہیں یہ ترجمہ و محشی قرآن مجید رقوم کی ترسیل کے مطابق ترتیب وار بھیجا جائے گا

ہدیہ قسم اعلیٰ - ۷۵ روپے

ہدیہ قسم دوم - ۶۰ روپے

پیشگی قیمت ارسال کرنے والے حضرات سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا

ناظم ادارۂ ترجمان القرآن۔ اچھرہ - لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ ---- ۴۱۱۰۱۷